اِرم کالج اعظم پورہ میں پیش کردہ
چند دینی تقاریر کا خلاصہ
مع
فقہی مذاکرہ

ترتیب کار:
یوسف رَوِش

نام کتاب : "مہکتی باتیں"
ترتیب کار : یوسف روش
ایم۔ٹیک (عثمانیہ)
بارِ اوّل : اگست ۱۹۹۵ء
تعداد اشاعت : (۲۵۰) سائز : ڈیمائی $\frac{۳۶\times۲۲}{۱۶}$
سرورق : محمود سلیم
کمپیوٹر کمپوزنگ : سید محمد ایوب۔ النعم کمپیوٹرس
طباعت سرورق : کیشاوا پرنٹرس بازار گھاٹ روڈ حیدرآباد-۴
طباعت : اسپیڈ پرنٹرس، سعید آباد حیدرآباد

قیمت : ۲۰ بیس روپے

ناشر :

سیما پبلشرز اینڈ بک پروموٹرس
74- دینکٹ گیری نگر، یوسف گوڑہ حیدرآباد 500045

ملنے کے پتے :

یوسف روش، مکان نمبر 3/A/536-8-16 جدید ملک پیٹ حیدرآباد 24
حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد-2
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں۔ دہلی 110006

فہرس

چند دینی تقاریر کا خلاصہ

حمد

ہوجائے مجھ کو عشق و جنوں تیرے نام سے
دستِ دعا دراز کروں تیرے نام سے

سب کچھ چھپا ہوا ہے خدا تیرے نام میں
ہر سانس کا حساب رکھوں تیرے نام سے

اخلاص کی کتاب کو آنکھوں سے چوم لوں
پڑھنا ہے بار بار پڑھوں تیرے نام سے

چاہے خوشی ملے یا ملے غم کا وسوسہ
بے ساختہ میں پیار کروں تیرے نام سے

دھڑکن کی لے پہ کیوں نہ مناجات کے لئے
شام و سحر تمام کروں تیرے نام سے

میں تو رؔوش غلام ہوں بس تیرے نام کا
نسبت تو ہے مروں یا جیوں تیرے نام سے

****

نعت

نبیؐ کے نام کا رشتہ رگِ لماں سے ملتا ہے
محمدؐ کی غلامی سے گُلِ عرفان کِھلتا ہے

نہ توڑو دل کسی کا بے سبب اس دہرِ فانی میں
کہ ٹوٹے دل کی آہوں سے خدا کا عرش ہِلتا ہے

خدا توفیق دے بیماریٔ دل کی دوا کر لوں
لگا ہے زخم کچھ ایسا نہ دُھلتا ہے نہ سِلتا ہے

عطا ہوتی ہیں لطفِ بندگی میں نعمتیں کیا کیا ؟
مکانِ خلد ملتا ہے ، اِرم کا باغ ملتا ہے

محمدؐ کی اطاعت ہی اطاعت ہے روشِ رب کی
محمدؐ کی اطاعت سے خدا کا نور ملتا ہے

****

پیش لفظ

مسلمانان حیدرآباد و سکندرآباد پر خدا کی یہ بڑی عنایت ہے کہ اس نے جہاں کئی علماء و اکابر کے ذریعہ کئی دینی مراکز اور اداروں میں دینی کام جاری فرمایا وہیں چند مخلص اور حساس دلوں میں اسلامی شریعت کی اشاعت کا ذوق بھی اجاگر فرمایا انہی میں ایک نام ہے جناب سید جمیل الدین صاحب .... جو بہ اعتبار پیشہ ٹیکس ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہیں لیکن موصوف نے اپنے دینی جذبہ کے تحت اپنی رہائش گاہ "ارم کاٹیج واقع اعظم پورہ کے ایک حصہ کو دینی اغراض کے لیے وقف کر دیا ہے ۔ چنانچہ "ندوہ ایجنسی" اور "دار المطالعہ ندوہ" کے نام سے جو کتب خانہ قائم ہے وہاں مطالعہ کے علاوہ دینی کتب رعایتی شرح پر فروخت کی جاتی ہیں اور جو درس گاہ "دینی تعلیمی مرکز" کے نام سے موسوم ہے وہاں عموماً کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اور خصوصاً بالغان ملت کے لیے درس قرآن مجید کی مفت تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اور ہر سہ شنبہ کو دینی مذاکرہ کے تحت مقامی و بیرونی علماء و صلحا اپنا وعظ یا خطبہ، مغرب تا عشاء عامتہ المسلمین کے لیے بیان فرماتے ہیں اور ہر مہینے کی پہلی منگل کو "فقہی مذاکرہ" میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریری سوالناموں کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں دیا کرتے ہیں جو پرنسپل کی حیثیت سے دار العلوم سبیل السلام (بالاپور) میں قیام پذیر ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ناچیز جب تک جدید ملک پیٹ میں مقیم رہا، اکثر و بیشتر وعظ و بیان کے ان سلسلوں سے استفادہ کرتا رہا ۔ چنانچہ ان میں سے بعض تقاریر و بیانات کو اپنی عام زبان میں قلمبند کرنے کی جو سعادت احقر کو نصیب ہوئی انہی کی خاطر اس کتابچہ کے شائع کرنے کا ارادہ مضبوط ہوا اگرچیکہ پیش کردہ تقاریر یا بیانات یقیناً ان کی اپنی حقیقی کیفیت و چاشنی سے محروم ہیں جو واعظین کے اپنے مخصوص و منفرد انداز

میں پیش ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود کوشش اس بات کی گئی ہے کہ حتی الامکار
بیانات کے مطالب اور اہم نکات ہاتھ سے جانے نہ پائیں۔
دعا ہے کہ خدا انہیں نافع بنائے اور طفیل میں ناچیز کی مغفرت فرمائے

آمین

احقرالعباد
سید یوسف روشؔ

۱۵ مارچ ۱۹۹۱

۶ ستمبر ۱۹۸۸ء سہ شنبہ

انسان کی حیثیت عرفی کا مقام اسلام میں

(مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

جاننا چاہئے کہ انسان کی حیثیت عرفی حسب ذیل چار چیزوں سے بنتی ہے۔ اور وہ سماج و معاشرہ میں ایک ذی حیثیت اور باوقار شخصیت کا حامل ہوتا ہے! اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر اس کالحاظ رکھا ہے اور اس کی رعایت فرمائی ہے۔

(۱) بوجہ علم (۲) بوجہ تقویٰ یا عمل و کردار (۳) بوجہ درازی عمر (۴) بوجہ اقتدار و عہدہ (چاہے وہ غیر مسلم یا منافق ہی کیوں نہ ہو)

مثال کے طور پر منافق عبداللہ بن ابی اور ابوسفیان جو دشمنان اسلام تھے لیکن ان کی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ لحاظ اقتدار و عہدہ رعایت فرمائی۔ چنانچہ جمعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ سے پہلے عبداللہ بن ابی کا بیان ہوا کرتا تھا اور امن کے سلسلہ میں ابوسفیان کے مکان میں قیام کو بھی حضور صلعم نے امن فرمایا۔

اسلام میں تنقید یعنی نہی عن المنکر کی اجازت ہے۔ اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے چاہے وہ خلیفہ کے خلاف ہو یا حاکم کے خلاف ہو یا باپ وغیرہ کے خلاف ہو۔ لیکن اسلام میں تنقیص یعنی اہانت یا تحقیر کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی برسرعام کسی کی شخصی توہین کرے۔

جدید مسائل کا شرعی حل

(مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی تقریر کا خلاصہ)

۳۰ مئی ۱۹۸۹ء سہ شنبہ

زیر بحث عنوان سے مراد یہ ہے کہ نئے زمانے میں نئے حالات کے تحت سماج میں کیا نئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور جدید آلات و وسائل کے پیدا ہونے کے نتیجہ میں اسلام کس طرح ان مسائل کو حل کرتا ہے ۔ موضوع خشک ضرور ہے لیکن مشکل اور دشوار بھی ہے ۔ حتی الامکان کوشش کی جائے گی کہ ان مسائل کو آسان اور سہل بنا کر پیش کیا جائے ۔ یہ موضوع اسلام کا فنی اور مشکل موضوع ہے خطاب کے لیے بھی اور مخاطب کے لیے بھی ۔

میں نے جس آیت کا انتخاب کیا ہے وہ اس معاملہ میں اصل ہے یعنی:

ان الدین عند اللہ الاسلام ترجمہ: اللہ کے نزدیک تمام نظام حیات میں جو قانون اور سسٹم قابل قبول ہے وہ " اسلام " ہے جو حضور صلعم پر مکمل کیا گیا اور اس کا بہترین نمونہ حضور صلعم کی سیرت و زندگی ہے ۔ اسلام کا یہ بڑا دعویٰ ہے ۔

دنیا کے کسی مذہب کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ مذہب سچا ہے ، آسان ہے کیوں کہ عموماً ہر مذہب میں اچھائیاں ہوا کرتی ہیں لیکن یہ کہنا کہ فلاں مذہب قیامت تک کے لیے قابل عمل ہے ، بہت مشکل ہے ۔ لیکن یہ دعویٰ مذہب اسلام نے کیا ہے کہ اس کی ابدیت تا حشر قائم رہے گی ۔ انسانی سماج کے لیے فطری بنیادوں پر تمام اصولوں کو اسلام نے ایسا تقسیم کیا ہے کہ وہ سہل بھی ہیں اور قابل عمل بھی ۔

مذہب و قانون کی تاریخ پڑھی جائے تو اسلام کے سوا کسی مذہب نے ایسا دعویٰ نہیں کیا ہے ۔ خود ہمارے ملک کے قانون اور دستوری ڈھانچہ میں کئی

تبدیلیاں ہوئی ہیں اور شاید ہوتی رہیں گی کیوں کہ یہ انسانوں کے مرتب کردہ قوانین ہیں ۔ کئی مذاہب ایسے ہیں جنہوں نے علی الاعلان اسلامی شریعت کی مخالفت اور مذمت کی لیکن آج دھیرے دھیرے اسلامی اصولوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں ۔ خصوصاً طلاق اور میراث کے مسائل میں ۔

اسلام میں نکاح کی حیثیت ایک معاہدہ کی ہے نہ کہ خونی رشتہ کی جیسے ماں ، بھائی بہن وغیرہ کے رشتے جو کہ خونی اور اٹوٹ رشتے ہیں ۔ نکاح دراصل فریقین کے مابین معاہدہ یا (CONTRACT) ہے اس لیے اس رشتہ کو ان صورتوں میں توڑا جانا اک سماجی ضرورت ہے جب فریقین میں نباہ نہ ہو ، شدید اختلاف ہو یا آپس میں قلبی سکون نہ ہو ۔ ان ہی حالات میں طلاق کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ اگر طلاق کا تصور نہ ہو تو نوبت قتل اور خودکشی وغیرہ کی پیدا ہو جاتی ہے ۔ جیسا کہ اخبارات میں ایسی اطلاعات ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ قدرتی بات ہے کہ پانی کا بہاؤ شدید ہو تو وہ کٹہ توڑ کر نکل جاتا ہے ۔ اسی لیے نامناسب حالات میں فریق نکاح کے بندھن کو توڑ کر غیر مناسب راستہ اختیار کرتا ہے یعنی خودکشی یا قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اس ضمن میں اسلام نے طلاق کا فطری راستہ بتایا ہے اگرچیکہ یہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے لیکن جب سماجی ضرورت ہو تو اس معاہدہ کو توڑا بھی جا سکتا ہے ۔

پہلے پہل عیسائیوں نے اس کی مخالفت کی کہ جس رشتہ کو خدا نے جوڑا ہے اسے کیوں توڑا جائے ؟ ہندو مذہب میں تو طلاق کا تصور ہی نہیں بلکہ ستی کی ظالمانہ رسم ہے لیکن آج کل دونوں مذاہب میں طلاق کو کم و بیش تسلیم کیا جا رہا ہے ۔ یہ حضور صلعم کا اعجاز ہے کہ اسلامی قوانین ہر زمانے کے ساتھ ہیں بلکہ تھے اور انشااللہ رہیں گے ۔

طلاق میں عدّت کا تصور اسلام کی دین ہے ۔ طلاق کی ایک خاص صورت میں عورت جب یکے بعد دیگرے دو مردوں سے نکاح کرتی ہے تو ان دونوں کے درمیان ایسا فصل رکھا گیا ہے کہ نسب پیچیدہ اور متزلزل نہ ہونے پائے ۔

میراث کو اسلام نے اتنا فطری رکھا ہے کہ انسانی ذمہ داریوں کے مطابق اس میں پوری پوری رعایت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مذاہب نے اسلامی نقطہ نظر سے میراث کی تقسیم کو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ آج مانا ہے۔ جہاں تک انصاف کا تقاضا ہے اکثر مذاہب اسی لیے اسلامی اصولوں کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کوئی مذہب اس بات کا دعویدار نہیں کہ موجودہ دور کے نت نئے مسائل کو حل کرے گا۔ یہ جراءت کسی نے نہیں کی۔ صرف اسلام نے اس کا دعویٰ کیا ہے۔

ہندو مذہب میں بیوہ کے نکاح کا تصور ہے نہ میراث کی تقسیم کا... **اسلام وہ واحد مذہب ہے جو آج بھی قابلِ عمل ہے** اور آئندہ بھی رہے گا اگرچہ مسلمان اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ کھلی ہوئی شہادت اور تصدیق ہے کہ جو مذہب باقی رہنے والا ہے اور معتبر ہے وہ اسلام ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں جو ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ (۱) انسانی فطرت (۲) وہ وسائل یا ذرائع جنہیں انسان فطری اغراض کے لیے اختیار کرتا ہے۔ مثلاً: کسی کو "نقصان" پہنچایا جائے تو جذبۂ انتقام پیدا ہونا فطری ہے۔ اس کے لیے کیا ذرائع استعمال کئے جائیں یہ دوسری بات ہے۔ اس کے لیے کبھی تلوار استعمال کی جاتی تھی تو آج بندوق یا پستول کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی زہر دیا جاتا تھا تو آج زہر کے انجکشن یا گولیاں دی جاتی ہیں۔ کبھی بھرے سماج میں مذموم اور بے ہودہ اشعار سے مذمت کی جاتی تھی تو آج اس کی تکمیل صحافت اور اخبار سے کی جاتی ہے۔

اسی طرح "بھوک" انسانی فطرت ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے تدبیر کیا ہو گی؟ یہ زمانوں کے طریقہ، پکوان پر منحصر ہے۔ کبھی گرم پتھروں پر گوشت پکایا جاتا تھا تو آج پریشر کوکر سے یہ کام لیا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اسلامی قانون میں اصل بحث "فطرت" سے ہے نہ کہ وسائل یا اسباب سے۔ کیوں کہ انسان کی کل بھی جو فطرت تھی وہ آج بھی موجود ہے اگرچیکہ

وسائل، ذرائع یا اسباب بدلتے ہیں اسی لیے فطرت ہی کو اسلام نے موضوع بنایا ہے۔
خوش الحانی پسندیدہ فطرت ہے۔ کبھی اونچی عمارتوں میں بازگشت سے لطف اندوزی ہوا کرتی تھی تو آج لاؤڈ اسپیکرس اس کا ذریعہ ہیں۔
اسی طرح اسلام نے ظلم کو ناپسند کیا ہے اور مظلوموں کی حمایت کو پسند کیا ہے۔ اس کے لیے وسائل چاہے کچھ ہوں۔
یہی نظریہ و نکتہ ہے جس کے تحت قیامت تک کے لیے یہ قانون محفوظ رہے گا یعنی اسلامی قانون یا شریعت میں پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر زمانہ کے لیے ہے اور رہے گا۔
احکام میں جو فقہی مسائل ہیں اس کی تقسیم تین طریقوں پر ہے۔
(۱) قطعی (۲) اجتہادی (۳) مصلحی
(۱) قطعی: وہ ہیں جو کتاب اللہ اور حضور صلعم کی سنت سے ثابت ہوں جس میں کوئی اختلاف نہ ہو حتیٰ کہ کسی دو آیات یا دو احادیث سے بھی اختلاف موجود نہ ہو۔ یہ قطعی کہلاتے ہیں۔
مثلاً: انسانوں کو قتل کرنا جائز نہیں۔ یہ متفقہ قانون ہے۔ اب اس میں اگر مثال کے طور پر یہ گنجائش نکالی جائے کہ کسی لاعلاج مرض یا کینسر کے مریض کو (قدرتی موت سے پہلے) ہمیشہ کی تکلیف سے نجات دلانے کے لیے زہر کا انجکشن دیا جائے تو کیا حکم ہے؟ جسے قتل بہ جذبہ رحم کہا جاسکتا ہے تو اسلامی شریعت میں اس کی اجازت نہیں۔ کیوں کہ قتل نفس یا خودکشی جائز نہیں۔ حالانکہ تکلیف و مشقت سے نجات پانے کے لیے یہ اقدام کیا جارہا ہے۔ اگر اس کی اجازت دی جائے تو اس سے زبردست اخلاقی بحران پیدا ہوگا۔ توجیہ یوں ہے کہ اللہ نے ہر بیماری کا علاج رکھا ہے یہ اور بات ہے کہ انسانی عقل اس تک نہ پہنچی ہو۔ دیکھا جاتا ہے کہ آج ایک مرض لاعلاج ہوتا ہے تو کل اس کا علاج خود تحقیق سے نکل آتا ہے۔
اسی زمرہ کا ایک مسئلہ "سود" کا ہے۔ یہ متفق علیہ ہے کہ سود حرام ہے۔ قرآن

ورسولؐ دونوں نے سودی کاروبار میں گرفتار شخص کو قابل لعنت قرار دیا ہے۔اس کے لین دین والے، حساب کتاب رکھنے والے، گواہی دینے والے وغیرہ وغیرہ سب قابل ملامت ہیں۔یہاں تک کہ سود میں ملوث شخص ایسا ہی ہے جیسے اس نے اپنی ماں سے زنا کیا ہو۔اب اگر آج کل کے روشن خیال احباب اس کی اجازت مانگیں تو بھلا کس طرح اس کی گنجائش نکلے گی۔اللہ تعالیٰ کے احکام میں حد سے تجاوز کر جانا کسی طرح ممکن نہیں۔

(۲) اجتہادی: اللہ اور رسولؐ کے کلام میں ٹکراؤ یا اختلاف نہیں ہو سکتا۔صاف بات ہے کہ جو آدمی جھوٹا ہوتا ہے تو اس میں ایسا شبہ کیا جا سکتا ہے۔نعوذ باللہ کلام اللہ جھوٹ سے پاک ہے اور رسول اللہؐ کی ذات گرامی بھی۔

معلوم ہو کہ اللہ کے بعض احکام میں حکمتاً تدریج برتی گئی ہے یعنی پہلے ایک حکم دیا گیا، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔۔۔۔شراب کے سلسلہ میں اگر ممانعت کا حکم ایک ہی مرتبہ نازل ہوتا تو شاید عرب شراب کی حرمت کو فوراً تسلیم نہ کرتے کیوں کہ وہ شراب کے خوگر تھے اور شراب انہیں مرغوب تھی۔چنانچہ پہلا حکم یہ اترا کہ بحالت نشہ کوئی نماز کے قریب نہ جائے۔دوسرے حکم میں یہ بتایا گیا کہ شراب کے نقصانات اس کے فائدے سے کہیں زیادہ آگے ہیں۔پھر تیسرے حکم میں شراب حرام کر دی گئی لیکن ابتدا میں شرابیوں کے لیے سزا ہلکی رکھی گئی۔یعنی ڈانٹ ڈپٹ کی حد تک ۔۔۔۔۔پھر کثیر تعداد میں لوگ ترک شراب کے عادی ہو گئے تو سزا سخت کر دی گئی یعنی اسی درے مارنے کا حکم نافذ ہوا۔۔۔۔۔اگر کوئی اپنی نافہمی سے یہ نہ جان سکے کہ پہلا حکم کیا تھا اور بعد کا کیا اور اختلافات احکام پر نکتہ چینی کرے تو الزام احکامات پر نہیں ہوگا بلکہ کہنے والے کی نافہمی پر۔۔۔۔۔ایسے ہی مسائل کو اجتہادی مسائل کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک ہی حکم میں تشریح دو اشخاص کے لیے الگ الگ ہو تو بھی اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے۔مثلاً ترمذی کی حدیث ہے کہ جو آدمی کسی عورت کو

چھولے تو وضو کرنا چاہئے ۔ یہ شافعی مسلک ہے لیکن امام ابوحنیفہ رح نے اس کا مطلب یوں نکالا کہ یہاں عورت سے غیر محرم مراد ہے جس کو مرد اگر شہوت سے چھولے تو ایسی صورت میں وضو ٹوٹ جائے گا۔ یعنی حدیث تو ایک ہی ہے لیکن توجیہ اور مسائل کو استنباط کرنے میں اور غور و فکر کرنے میں صورت اور شکل دو اماموں کے نزدیک الگ الگ ہے۔

بعض مرتبہ مضمون میں قرآن و حدیث کا ٹکراؤ تو نہیں ہوتا البتہ صحابہ یا تابعین کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ مثلاً: ایسی خاتون جس کا شوہر لاپتہ ہو تو عورت کیا کرے ؟ شریعت کے دو پہلو ہیں کہ عورت اس صورت میں نکاح کرے جب کہ شوہر یا تو مرجائے یا اسے طلاق دے دے لیکن شوہر کے غائب ہونے سے یہ دونوں کام واقع نہیں ہوتے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ امام ابوحنیفہ رح نے کہا کہ ایسی صورت میں عورت کا نکاح باقی رہے گا جب تک کہ اس کے ہم عمر لوگ وفات نہ پاجائیں چاہے اس میں پندرہ بیس سال کیوں نہ لگ جائیں ۔ سوال اب کفالت اور نفقہ کا آتا ہے کہ یہ تو شوہر کے ذمہ ہے لیکن لاپتہ شوہر اس کا مکلف بھی نہیں تو عورت کے حوائج ضروریہ کو کون پورا کرے گا ؟ اس لیے امام مالک رح نے صرف چار سال تک انتظار کی اجازت دی اور کہا کہ آگے عورت نکاح کر سکتی ہے ۔ اس مقدمہ میں طویل مدت تک عورت کا انتظار ظاہر ہے کہ اک فتنہ سے کم نہیں اس لیے اس معاملہ میں بطور اجتہاد امام مالک رح کے فیصلہ پر حل درست قرار دیا جانا چاہیئے اور امام ابوحنیفہ رح کے مسلک کو چھوڑ دینا چاہیئے ۔

واضح ہو کہ جو مسائل قطعی ہیں ان میں زمانے و حالات کے تحت کوئی تبدیلی نہیں ہوتی البتہ اجتہادی مسائل میں تبدیلی کی گنجائش ہے ۔ مثلاً: شافعی مسلک میں دوران حج خانہ، کعبہ کے طواف میں وضو ضروری ہے لیکن یہ اک مشکل کام ہے کہ کثیر مجمع میں کسی غیر عورت کے جسم یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کے نادانستہ طور پر چھونے سے بچا جاسکے ۔ چنانچہ اجتہادی طور پر اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رح کی رائے پر اتفاق

کیا جانا چاہیئے کہ ایسے میں وضو نہیں ٹوٹتا جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے۔

(۳) مصلحی: ایسے مسائل جو خاص زمانے کی مصلحت یا حالات پر مبنی ہوں۔ مثال کے طور پر پہلے زمانے میں خلیفہ کا انتخاب ہوتا تو لوگ بیعت کرتے تھے۔ اب اگر وزیر اعظم کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو لازم سمجھا جائے تو یہ عوام کے لیے ممکن نہیں۔ اسی کو ووٹ کی صورت میں باندھا گیا ہے کہ وہ بیعت کرنے کے مماثل ہے۔

اسلام میں ہے کہ جب کسی ملک پر حملہ کیا جائے تو وہاں نہ آگ لگائی جائے نہ معذوروں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھایا جائے اور نہ عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا جائے یہ اسلام کے جنگی قانون سے ہے۔ آج کل اگر جنگی اسلحہ جات استعمال کئے جائیں تو یہ تمیز باقی نہیں رہتی کہ جنگی اور غیر جنگی لوگ کون ہیں اور ان میں عورتیں اور معذور کتنے ہیں۔ اس سے قطع نظر موجودہ حالات کے تحت جدید اسلحہ جات جو جنگی وسائل ہیں استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

دور قدیم میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز تھا کیوں کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل تھا اور قوت و بالادستی بھی حاصل تھی ۔۔۔۔۔ اور اس بات کا خطرہ کم تھا کہ کسی عیسائی یا یہودی بیوی سے متاثر ہو کر مرد اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھے گا لیکن آج کا ماحول الگ ہے۔ آج عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں سیاسی، معاشی و اقتصادی طور پر بالادستی حاصل ہے۔ چنانچہ آج ایسا کرنے میں سرمایہ ایمان سے محرومی ہو گی۔

سماج میں اخلاقی حالت کی تبدیلی ہو تو نئی صورت حال چیلنج بن جاتی ہے۔ جیسے ہمارے فقہا نے لکھا ہے کہ گواہ کا عادل ہونا ضروری ہے یعنی جو گناہ کبیرہ نہ کیا ہو۔ اب چراغ رخ زیبا لے کر ڈھونڈیں تو بھی ایسا گواہ نہ ملے گا۔ اس سے مظلوم کی دادرسی نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں امام یوسف کا فتویٰ ہے کہ ایسا شخص گواہ کے لیے کافی ہے جس کا جھوٹ اگر ثابت ہو جائے تو لوگوں میں وہ شرمندہ ہو یعنی اس میں اتنی غیرت باقی ہو۔ مسئلہ میں تبدیلی کی یہ ایک مثال ہے۔

فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چند خاص جرائم میں سزا کو متعین کرنے کا حق قاضی کو حاصل ہے۔ اگر موجودہ زمانہ میں جج کو یہ اختیار دیا جائے تو وہ اسے بآسانی رشوت خوری کا ذریعہ بنالیں گے اور رشوت کے زور پر ایک ہی جرم کی پاداش میں کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ سزا مقرر کریں گے اور انصاف باقی نہیں رہے گا۔

دوسرے قسم کے مسائل وہ ہیں جو معاشی ہیں یعنی کسبی، مالی واقتصادی وغیرہ ہیں بھی زمانے کی تبدیلی کے ساتھ مسائل کی تبدیلی ممکن ہے۔

کسی چیز کا عرف بن جانا یعنی رواج پاجانا اس طرح کہ وہ قانون کے خلاف نہ ہو تو جواز کی شکل اس میں سے نکالی جا سکتی ہے۔ مثلاً پگڑی کا مسئلہ جس میں کرایہ دار کا استحصال ہے۔ اسے جائز نہیں ہونا چاہئے لیکن علامہ شامی نے لمبی بحث کرتے ہوئے یوں توجیہ و تاویل کی ہے کہ اسے درست بتایا ہے۔

پگڑی کی پوزیشن میں آج کل دینے والے اور لینے والے دونوں کے لیے منفعت ضرور ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پگڑی جائز ہے لیکن مالی سسٹم میں ایسی تبدیلی ہو کہ اسلامی روح اور اسپرٹ باقی رہے تو اس میں جواز کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔

سیاسی نظام میں تبدیلی یا تغیر ہو تو بھی مسئلہ بدلتا ہے۔ مثلاً اگر شوہر بیوی کو نہ نفقہ دیتا ہے اور نہ طلاق تو بیوی بیت المال سے شوہر کے نام پر قرض لے سکتی ہے جسے شوہر بعد میں ادا کرتا ہے اور عدالت اس بات کی اجازت دیتے ہوئے اک وثیقہ مرتب کرتی ہے۔ لیکن اب ہندوستان میں یہ طریقہ قابل عمل نہیں ہے کیوں کہ یہاں نہ اسلامی حکومت ہے نہ بیت المال کی صورت۔

ایک مسئلہ ہے ــــــــ سر کھلا رکھنا یا چھپانا ــــــ عبادات کے ماسوا عام حالت میں عوام جو سر کو کھلا رکھتی ہے اس کا انحصار سماج کے عرف و رواج پر ہے۔ جہاں سر کے چھپانے کو احترام کا جز سمجھا جاتا ہو تو اس سماج میں سر کو چھپانا ضروری ہے ورنہ جزو احترام نہ سمجھا جائے تو مجبوری ہے۔

مسلمان عورتوں کا ساڑی پہننا اک زمانہ میں ناجائز قرار دیا گیا تھا کہ وہ خاص

ہندوؤں کا لباس تھا۔ اب لباس و شعار بدل گیا ہے اور مسلمان عورتوں کا رواج بن گیا ہے اس لیے اب استعمال کرنے کی کراہیت جاتی رہی۔ اس کو مفتی کفایت اللہ صاحب نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

ایک اور صورت میں افراد کے بدل جانے سے بھی مسئلہ بدل جاتا ہے۔ مثلاً بہ حالت روزہ جوان مرد کو بیوی سے بوس و کنار نہ کرنا چاہیے تاکہ شہوت کے غلبہ میں روزہ فاسد نہ ہو جائے البتہ معمر آدمی کے لیے ایسا اندیشہ موہوم ہے۔

کسی مفتی کے پاس ایک شخص آیا اور دریافت کیا کہ قتل کے بعد کیا توبہ کی گنجائش ہے؟ مفتی نے اثبات میں جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص وارد ہوا اور وہی سوال دہرایا۔ مفتی نے نفی میں جواب دیا۔ شاگردوں نے اس اختلاف کی وجہ دریافت کی۔ کہا گیا کہ پہلے شخص کی حالت اور آثار سے مجھے علم ہوا کہ وہ واقعی قاتل تھا اسی لیے معافی کی غرض سے توبہ کی اجازت دی گئی جب کہ دوسرا شخص قتل کرنا چاہتا تھا سو میں نے انکار کیا تاکہ وہ قتل سے بچ جائے۔

وسائل کے بدل جانے سے بھی مسائل بدلتے ہیں۔ مثلاً پہلے زمانے میں پاگل پن کی جو علامات تھیں وہ اپنی جگہ ہیں۔ بعض اوقات پاگل دوران گفتگو اتنا سلجھا ہوا لگتا ہے کہ جیسے کوئی اعلیٰ قسم کا فلسفی ہو مگر دوسرے ہی لمحہ کوئی ایسی بات کر جاتا ہے کہ فلسفہ پر پانی پھر جاتا ہے۔ یہ تو پرکھنے کی بات ہوئی لیکن بعض اوقات دقت پیش آتی ہے۔ اس لیے دور حاضر میں جدید آلات سے نہ صرف پاگل پن کی دریافت ہو سکتی ہے بلکہ علاج بھی۔

اسی قسم کا معاملہ اعضا کی پیوند کاری کا ہے۔ حالانکہ حدیث کے مضمون سے اس کا ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے یعنی یہ کہ لعنت فرمائی ہے حضور صلعم نے اس عورت پر جو کسی دوسری عورت کے بال اپنے بالوں میں لگائے۔ غور کیا جائے تو اعضا کی پیوند کاری میں انسانی حفاظت و صیانت کا پہلو ملتا ہے۔ بہر حال ابھی یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ اس کا کیا حل ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ جدید مسائل کا حل کون پیش کرے؟ ہر کس و ناکس کو اجتہاد کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے آپریشن کے لیے ہر کسی کے ہاتھ میں چھری دے دی جائے۔ اس میں کئی جانیں فوت ہو جائیں گے کہ ہر کوئی ڈاکٹر یا سرجن نہیں ہوتا۔

میری اپنی ناقص رائے میں چند معتبر علما اجتماعی طور پر مل کر جدید مسائل پر اس طرح غور کریں کہ دلوں میں نفس پرستی یا ہوس پرستی نہ ہو اور نہ ذاتی رائے کو دخل ہو بلکہ خالص قرآن و حدیث کو پیش نظر رکھ کر حضور صلعم کی سیرت اور صحابہ و تابعین کے واقعات کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کریں۔ یہ زمانہ کا چیلنج ہے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ اسلام کی ابدیت تا حشر ہے اور انشاءاللہ رہے گی۔

حال ہی میں ایک بہت بڑا سمینار شہر دلی میں ہوا جس میں تحقیقی و علمی بحث اعلیٰ پیمانہ پر کی گئی اور ہندوستان کے مختلف شہروں سے علما کی ایک بڑی تعداد اس میں شریک رہی۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل مسائل پیش کئے گئے تھے:

(۱) اعضا کی پیوند کاری

(۲) پگڑی سسٹم

(۳) خاندانی منصوبہ بندی

وقت کی کمی کے باعث ابتدائی دو مسائل پر بحث ادھوری رہی جب کہ آخری مسئلہ طے کر دیا گیا۔

۲۸ جون ۱۹۸۸ء سہ شنبہ

اصلاح کا حکیمانہ انداز

(مولانا محمد رضوان القاسمی)

انسان کے لیے شر پیدا کرنے میں دو محرکات ہیں۔

داخلی: نفسانی خواہشات   خارجی: شیطانی وساوس

خیر کی طرف آنے میں ان رکاوٹوں کو دخل ہے۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے کہ مضبوط قوت ارادی اور عزم کے ساتھ انسان شر کو چھوڑ کر خیر کی طرف آئے۔ تمام انبیائے کرام نے خدا کے خیر والے راستہ کی طرف لوگوں کو اور امت کو بلایا اور دعوت دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو نبی آخرالزماں ہیں دین کی دعوت دی اور اس میں رکاوٹوں، مصیبتوں اور تکالیف کا سامنا کیا۔

ہر مسلمان اپنی جگہ ایک داعی ہے۔ اس لیے اس سے اس کی رعیت (ماتحت افراد) کے بارے میں سوال ہوگا کہ دین کی دعوت یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی طرف توجہ دلائی کہ نہیں؟

اصلاحی دعوت میں نرمی، شائستگی اور اخلاص کو ملحوظ رکھنا چاہیئے تاکہ جسے دعوت دی جائے وہ متاثر ہو اور نیکی کی طرف راغب ہو۔۔۔ اگر غیظ و غضب، سختی اور اپنی علمیت کی دھونس جمانے کا ارادہ و منشا پیش نظر ہو تو دعوت کا رائگاں جانا کچھ مشکل نہیں۔

امام شافعی رح کا قول:

"کسی کو تنہائی میں توجہ دلانا نصیحت ہے اور بھری محفل میں توجہ دلانا فضیحت یعنی رسوائی اور اہانت ہے۔"

واقعات:

(۱) حضور صلعم کے روبرو ایک نوجوان کا گستاخانہ سوال کہ "یارسول اللہ" مجھے

زنا کی اجازت دیجئے۔"

اس پر آپؐ نے برہمی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ صلاحیت اور حکمت سے اس کے دل کے کانٹے کو نکال باہر کیا کہ بالاخر وہ تائب ہو گیا۔

فرمایا کہ کیا یہ کام تو اپنی ماں کے ساتھ گوارہ کرے گا یا بہن کے ساتھ یا بیٹی کے ساتھ یا خالہ کے ساتھ یا پھوپھی کے ساتھ یا کسی اور رشتہ دار کے ساتھ ــــــ چنانچہ جب تو یہ قبیح عمل کسی کے ساتھ کرنے کا ارادہ کرے گا تو ظاہر ہے وہ بھی کسی کی ماں، بہن، بیٹی یا خالہ یا پھوپھی ہو گی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے زمانے میں انہیں اپنے ایک ذی اثر حاکم کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ رات دن شراب نوشی میں بتلا ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے منشی سے ایک خط لکھوایا جس میں پہلے خدا کی شان و حمد بیان کی اور گناہوں پر معافی کے بعد جزا کی خوشخبری پھر سزا و وعید کا بیان لکھوایا اور قاصد سے کہا کہ یہ خط اس وقت ان کے حوالے کرنا جب ان کا نشہ ختم ہو جائے اور ادھر ان کے لیے دعائے مغفرت کی سچنانچہ یہ نصیحت آمیز خط کارگر ثابت ہوا اور اس شخص نے شراب سے توبہ کر لی۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصلاح میں پہلے جزا و صلہ کی خوشخبری دینی چاہیئے پھر عذاب و سزا کی بات بیان کرنی چاہیئے۔

قرآنی حوالہ:۔

"اے محمدؐ لوگوں کو اللہ کے راستہ کی طرف بلاؤ حکمت سے اور موعظہ حسنہ کے ساتھ"

حکمت سے مراد بعض مفسرین و محققین نے "قرآن" لیا ہے اور بعضوں نے اس کے معنی دانائی، عقلمندی اور صلاحیت کے لیے ہیں۔

مولانا تھانوی رح کا گناہ کے بارے میں ایک استدلال کہ وہ کس کی طرف سے ہے: یعنی اگر ایک ہی قسم کا گناہ بار بار سرزد ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ نفس کی طرف

سے ہے اور اگر کئی قسم کے گناہ مختلف موقعوں پر سرزد ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ شیطان کی طرف سے ہیں کیوں کہ شیطان چاہتا ہی ہے کہ انسان ہر مرتبہ مختلف گناہوں میں مبتلا رہے۔

۱۷رنومبر ۱۹۸۷ء سہ شنبہ

دانشمندی کا اسلامی تصور

(مولانا محمد رضوان القاسمی)

دانشمندی یا دانشوری کے متبادل معنی یہ ہوسکتے ہیں یعنی فہم، ادراک، سمجھ، شعور، بصیرت، ہشیاری، ذکاوت، ذہانت، زیرکی یا عقلمندی وغیرہ۔۔۔۔آج کل عام معنوں میں عاقل، دانشمند یا ہوشیار اسے کہا جاتا ہے جو اپنی مادی دنیا میں زیادہ ترقی کرے اور جو عملاً مذہبی کم ہو یا نہ ہو بلکہ مذہب والوں پر تنقید یا نکتہ چینی کرے ۔۔۔۔عام طور پر انسان عاجل اور جلد پانے والے منافع کی طرف لپکتا ہے یعنی آخرت کے مقابلہ میں دنیوی منفعت کی طرف زیادہ جھکتا ہے اور جو سرے سے اخروی زندگی یا مرنے کے بعد حساب کتاب لیے جانے پر یقین نہیں رکھتا یا شک وشبہ رکھتا ہے وہ تو بس اس مصرعہ کے مصداق کھاؤ، پئیو اور مست رہو پر عمل پیرا ہو کر زندگی کے ایام موج و مستی میں گذارتا ہے۔ یعنی بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مختلف قسم کے تمدن اور مختلف قسم کی تہذیبوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کی تقسیم یوں کی جاسکتی ہے۔

(۱) مادی یا حسی تمدن (۲) عقلی تمدن (۳) اشراقی تمدن (۴) اسلامی تمدن

پہلی دو قسم کے تمدنوں میں زیادہ مطابقت پائی جاتی ہے اور ان پر چلنے والے اپنی حس یا عقل کے زور پر نفع عاجل کو ترجیح دیتے ہوئے مادی ترقیات میں سرگرداں رہتے ہیں۔

(۳) اشراقی تمدن: بعض مذہبی بنیادوں پر سوچنے والوں نے یہ مانا کہ جسم پنجرہ ہے اور قفس کی مانند ہے اور روح پرندہ کے مانند ہے۔ جسمانی لذت جب ملتی ہے تو روح یہ چاہتی ہے کہ وہ انسانی جسم میں رہے۔ اشراقی فلسفہ کے علمبردار

(یونانیوں) نے یہ تصور دیا کہ روح کی پرواز ہونی چاہیئے۔ اسی لیے انہوں نے کہا کہ خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لیے جسم کو تکلیف اور اذیت پہنچانا ضروری ہے۔ چنانچہ ایک ٹانگ پر کھڑے رہنے کا مجاہدہ اور مختلف قسم کی ریاضتیں جس سے جسم کو تکلیف ہو، وضع کی گئیں۔ اسی سے رہبانیت نے بھی راہ پائی۔ لیکن اسلام میں رہبانیت نہیں

(۴) اسلامی تمدن: اسلام تمام انبیا کا مرکز رہا ہے اور اس کی شریعت تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مختلف انبیا کے دور میں بدلتی رہی ہے لیکن خاص اسلام یا "الاسلام" وہ ہے جو حضور صلعم پر نازل ہوا جو قیامت تک قائم رہے گا۔

ان الدین عند اللہ الاسلام (سچا دین خدا کے نزدیک اسلام ہے)

اسلامی تمدن و شریعت میں دانشمند وہ ہے جو اپنے نفس کا جائزہ لے، محاسبہ کرے تاکہ برائیوں کو گھٹاتے گھٹاتے ختم کیا جائے اور نیکیوں کو بڑھاتے بڑھاتے قائم کیا جائے۔

نفس تین ہیں:

(۱) نفس امارہ: کثرت سے برائیوں کی طرف لے جانے والا۔ اس کا علاج ضروری ہے۔

(۲) نفس لوامہ: نفس کا وہ درجہ ہے کہ جب برا کام ہو تو قلب میں کھٹکا ہو، ایک ٹیس اور چبھن کا احساس دل میں پیدا ہو۔ اسی کو قلب منیب بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی احساس شرمندگی ہو اور توبہ پر دل مائل ہو۔ یہ اچھی علامت ہے۔ ورنہ کثرت گناہ سے ضمیر مردہ ہوجائے تو انسان بے حس اور بے لگام ہوجاتا ہے اور دل سیاہ ہوجاتا ہے اور نصیحت کو بے اثر کر جاتا ہے۔ یہ نفس امارہ کی کیفیت ہے۔

(۳) نفس مطمئنہ: راضی ہوجانے والا نفس یعنی اللہ کے احکام پر نیک کام اور عمل کرنے والا بذات خود ایک ایسی لذت و راحت محسوس کرتا ہے جیسے کہ اس نے کوئی لذیذ اور عمدہ غذا کھائی ہو۔ یہ نمائشی جذبہ نہیں ہوتا بلکہ باطنی خوش دلی کے ساتھ ہوتا ہے۔

نیک کام وہ ہے جس سے دل مطمئن ہو اور برا کام وہ ہے جس سے دل میں کھٹک اور خلش ہو۔

عیسائی تصور صرف روح کے ساتھ ہے نہ کہ جسم کے ساتھ۔ اسی لیے روح کی پاکیزگی عیسائیوں کے نزدیک جسم کی پاکیزگی سے افضل سمجھی جاتی ہے۔

ہندو تصور میں "تناسخ" کو تسلیم کیا گیا ہے یعنی انسان اگر اچھے کام کرے تو مرنے کے بعد دنیا میں آکر دوبارہ اچھے انسان کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے ورنہ برے کام کرنے والا جانور کے روپ میں۔۔۔۔۔

اسلام نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دی اور یہ تصور دیا کہ دنیا کے رتی رتی کا حساب انسان کو آخرت میں دینا ہے اور یہ کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور سبھوں کو ہر وقت ہر لمحہ دیکھ رہا ہے۔ گناہوں سے بچنے کے لیے یہ تصور ایک عمدہ بچاؤ ہے۔ سورہ نبا کی آیت کا ترجمہ ہے:

"یہ عنقریب جان لیں گے کہ آئندہ زندگی ہے کہ نہیں۔"

منطقی پیرایہ میں سمجھایا گیا ہے کہ تم آخرت کے بارے میں اگر یقین نہ کرنا چاہو تو اپنی روزانہ کی نیند پر غور کرو اور یہ درس روزانہ دیا جاتا ہے لیکن غفلت، عبرت کو نظرانداز کر جاتی ہے۔

غور کیا جائے تو سو کر اٹھنے کی دعا کس قدر معنی خیز اور حقیقت افروز ہے یعنی الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور۔

تمام تعریف خدا کے لیے ہے جس نے ہمیں زندہ کیا بعد مار دینے کے اور ہم کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

قدم سوئے مرقد نظر سوئے دنیا
کدھر جا رہے ہو کدھر دیکھتے ہو
سلیمان ندوی

اس سلسلہ میں مولانا اشرف علی تھانوی رح کی تصنیف "شوق وطن" کا مطالعہ

مفید ہے جو انسان کو اپنے اصلی وطن یعنی آخرت کی یاد دلاتا ہے۔

اس طرح دانشمندی کا اسلامی تصور ذیل کے چار نکات پر مبنی ہے:

(۱) شریعت اسلامی کے مطابق نمازوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ مسلمان روزانہ کچھ حصہ خدا کی یاد میں گذاریں تاکہ خدا سے ملاقات کے آرزومند بنیں۔ یہ اسی وقت ہوگا جب مسلمان کو خدا، رسول اور آخرت پر یقین ہو۔ قیامت کے قائم ہونے کا عقیدہ ہو۔ حساب کتاب، جنت، دوزخ وغیرہ سب پر ایمان ہو۔

(۲) روزانہ اپنا محاسبہ کرے اور جائزہ لے کہ آج کون کونسے برے کام صادر ہوئے تاکہ ان کا تدارک کر سکے۔

(۳) کائنات میں ارض و سما اور اس کے درمیان کی تخلیقات پر غور و فکر کرے تاکہ خالق سے تعلق پیدا ہو۔

(۴) دن کا ایک حصہ غذا اور حصول غذا کے لیے وقف کرے۔ کسب معاش کو حلال طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۸۸ء، سہ شنبہ

ہدایت

(مولانا نوال الرحمن)

تمام صحابہ کرامؓ جو دین میں کامل تھے انہوں نے راست قرآن و حدیث سے
ن حاصل نہیں کیا بلکہ حضور صلعم سے کامل یقین اور صحیح عمل کے ساتھ دین کو
بھا۔ اسی طرح تابعین نے صحابہ سے اور تبع تابعین نے تابعین سے اسی انداز و طریقہ
رشد و ہدایت کے سلسلہ کو قائم رکھا اور آج تک بھی اللہ کے کاملین و متقی بندوں
، اپنی صحبت سے عام مسلمانوں کو اللہ کے کرم سے فیض پہنچایا اور پہنچا رہے ہیں
۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ پیری مریدی کو بدنام کرنے والے بعض سلسلے آج بھی
جود ہیں جن کے اغراض و مقاصد دنیوی زیادہ اور دینی کم ہیں۔ لیکن کاملین کا فقدان
یں۔ اس لیے سچے کاملین کی تلاش کی جائے، ان کا صحیح انتخاب کیا جائے تاکہ دل میں
مان کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے اور اعمال میں شہوت یعنی اپنی
اہشات کو دخل نہ ہو۔

جس طرح حضرت موسیٰ پر تورات کی تختیاں لکھی ہوئی نازل کی گئیں اسی
رح قرآن مجید بھی چھپا ہوا نازل کیا جاسکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔۔۔ رجال یا
سان سے انسان کو یہ علم و یقین کی دولت سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کی غرض سے
ضور صلعم کو ایک مکمل نمونہ بنایا گیا۔ حضور صلعم نے جو جو باتیں بیان کیں اور
ل سے کر دکھایا وہی اسوہ حسنہ عین اسلام ہے جس پر بلاشک و شبہ ایمان لانا اور
ں پر اپنی خواہشات کے بغیر عمل کرنا اصلی اور اہم ترین خزانہ ہے اور یہی "ہدایت"
ہے۔

آن حکیم میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے:

"ہم نے آدمؑ کو جنت سے زمین پر اتارا اور گندم کھانے کے نتیجہ میں ان کی دعا کو قبول کیا اور ان کی بخشش کی اور حکم دیا کہ زمین پر مال کو کام چلانے کی حد تک استعمال کرو پھر اسے وہیں چھوڑ دو (یعنی مال کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ انسان کے لیے اس کی ضروریات کی تکمیل کر سکتا ہے ورنہ یہ مال فی نفسہ خود کسی کام کا نہیں مثلاً۔ کپڑے والے کے پاس کپڑا ہے۔ اگر وہ غلہ کا حاجت مند ہے تو اس کے عوض غلہ لے سکتا ہے اسی طرح سونے چاندی والا مکان کے لیے تعمیر کے اشیا و زمین خرید سکتا ہے وغیرہ وغیرہ علی الہذا القیاس)۔

اور جو "ہدایت" ہماری طرف سے آئے (بذریعہ وحی) اس پر خود بھی عمل کرو اور دوسروں کو اس کا حکم دو۔ جو لوگ ہدایت پر چلیں گے وہ نہ گمراہ ہوں گے اور نہ شقاوت میں پڑیں گے بلکہ فلاح پائیں گے یعنی کامیاب ہوں گے اور جو ضلالت (گمراہی میں پڑیں گے (یعنی ہدایت چھوڑ دیں گے) تو وہ شقاوت میں گرفتار ہوں گے۔"

فلاح: یہ وہ ہے جس میں بقا کے بعد فنا نہ ہوگی، عزت کے بعد ذلت نہ ہوگی اور بے نیازی و تونگری کے بعد افلاس یا تنگی نہ ہوگی (گویا جنتیوں کی حالت)

شقاوت: (فلاح کی ضد ہے) یہ وہ ہے جس میں فنا کے بعد بقا نہ ہوگی (بلکہ ایسی حالت ہوگی کہ نہ اس میں مبتلا لوگوں کو موت آئے گی اور نہ حیات کی راحت ہوگی یعنی ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں گھرے ہوں گے)، ذلت کے بعد عزت نہ ہوگی اور تنگی کے بعد بے نیازی یا تونگری نہ ہوگی (گویا دوزخیوں کی حالت)۔

راست قرآن و حدیث سے استفادہ کرنے والے یا تاویلات نکالنے والے اکثر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرقہ معتزلہ، خارجی وغیرہ ان کی مثال ہیں۔ اسی لیے کاملین کی صحبت و تربیت اس ضمن میں اہم ہے بشرطیکہ کاملین کا صحیح انتخاب ہو۔

صرف قرآن پڑھنے کی مثال کہ سورہ بقرہ میں "الم" (الف، لام، میم) دراصل "الم" لکھا ہوا ہے نہ کہ (الف، لام، میم)۔ ایسا پڑھنا صرف حضور صلعم کی تعلیم کے مطابق ہم تک یہ سلسلہ پہنچا ہے۔ علی ہذا القیاس۔

جب انسان کے دل میں ایمان کی حقیقت اتر جاتی ہے تو بادشاہ صحرانوردی سے بھی باز نہیں آتا۔ جیسا کہ ابراہیم بن ادھم کا واقعہ۔ جنھوں نے شہنشاہیت کو لات مار دی تھی۔ اسی لیے ایمان کی حقیقت منکشف ہونے کے بعد مومن ظاہری چمک دمک، مال و دولت، حکومت، عزت وغیرہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی دولت کچھ اور ہوتی ہے۔ ہدایت پانے کا یہ مسئلہ انتہائی اہم ہے اور ہر مسلمان کو اس کا حاصل کرنا عین ضروری ہے اور اس کی زندگی کا عین مقصد ہے اس کو قطعی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔۔ ہدایت حاصل کرنے میں اس کی تخصیص نہیں کہ مرد ہے یا عورت کالا ہے یا گورا، مالدار ہے یا مفلس، تاجر ہے یا ملازم۔۔۔ وغیرہ یہ چیز ہر ایک کے لیے عین لازمی، مقدم اور ضروری ہے یہ مل گئی تو گویا سب کچھ مل گیا اور یہ نہ ملی تو گویا کچھ بھی نہ ملا۔

مولانا روم کے ایک شعر کا مضمون ہے:

"راہ خدا میں کسی کامل کی تلاش کر اور اس کے آگے خود کو بے حیثیت اور فنا کر" ○○

انبیاء کے واقعات

(مفتی مولانا عبدالوہاب)

پہلی قسط

۲۳۔ ڈسمبر ۱۹۸۷ء

جنت میں گندم کھانے کے نتیجہ میں جب آدمؑ اور حوا کے بدن سے جنتی لباس اتر گیا تو انہیں حد درجہ حیا دامنگیر ہوئی اور انھوں نے درختوں کے پتوں سے ستر پوشی کرنی چاہی مگر ہوتا یہ تھا کہ جب یہ لوگ پتے توڑنے کے لیے ٹہنیوں تک بڑھتے تو ڈالیاں اوپر کو ہو جاتیں بالآخر بحکم خداوندی زیتون کے پتوں سے یہ کام سرانجام پایا۔

خدا نے جب ان دونوں کو روئے زمین پر اتارا تو الگ الگ جگہوں پر اتارا۔ چنانچہ جدہ میں حوا کو اتارا۔ اسی مناسبت سے جدہ، جدہ قرار پایا کہ اس کے معنی ہیں " وادی "۔ اور آدمؑ کو سرزمین ہند میں سری لنکا کے قریب اتارا۔ کئی عرصہ تک یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا رہے۔ آدمؑ کی وحشت کو دور کرنے کے لیے مفسرین نے لکھا ہے کہ خدا نے کئی جانوروں کو ان کے پاس بھیجا۔ چنانچہ پہلے جس ہرن نے ان کی مزاج پرسی کی یا حال پوچھا اسے آدمؑ نے ایک زیتون کا پتہ پیش کیا جس کو کھانے کے بعد اس میں اس قدر مہک و خوشبو پیدا ہوئی کہ نسل در نسل خدا نے ان کی ناف یا پیٹ میں مشک کا سامان مہیا کیا۔

یہ حال دیکھ کر دوسرے ہرنوں نے بھی خوشبو پانے کی غرض سے آدمؑ کے حضور حاضری دی مگر ان میں وہ خوشبو (زیتون کا پتہ کھانے کے باوجود) اس لیے پیدا نہ ہو سکی کہ ان کی نیتوں میں اخلاص نہیں تھا۔ مزاج پرسی کا بہانہ تھا اور اصل غایت خوشبو حاصل کرنی تھی۔

اسی لیے خدا کے پاس بھی اعمال کے مقبول ہونے میں خلوص نیت کو کامل دخل ہے ۔چنانچہ لکھا ہے کہ شہد کی مکھی کا شہد حاصل کرنا، شہتوت کے کپڑے کا ریشم پانا اور خاص نسل کی گائے کا عنبر حاصل کرنا سب اسی زیتون کے پتہ کی دین تھی جو آدمؑ نے ان کو پیش کیا تھا اور جسے جنت سے لایا گیا تھا۔

عرفات کو عرفات اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں آدمؑ اور حوا نے بچھڑنے کے کافی عرصہ کے بعد ایک دوسرے کو پہچانا تھا اور ایک دوسرے سے ملاقات کی تھی کہ دونوں کو یہ حکم ملا تھا کہ کعبہ جس جگہ قائم ہے اس بیت اللہ کی طرف چلو ۔چنانچہ خانہ کعبہ کی پہلی بنیاد حضرت آدم کے ہاتھوں ہوئی ۔ تفصیلات کا موقع نہیں ہے کہہ کر مولانا نے حضرت موسیٰؑ اور شیطان سے ملاقات کے ضمن میں حسب ذیل خلاصہ بیان کیا

بھولنا: نسیان اور یاد نہ رہنا، انسان کی فطرت ہے ۔اگر غلطی سے بھول ایک وبال بن جائے یا گناہ کی صورت اختیار کر جائے تو توبہ وہ شخص کرتا ہے جس میں غرور تکبر اور گھمنڈ نہ ہو جیسا کہ آدمؑ کا گندم کھالینا پھر توبہ کرنا اور بخشش چاہنا ۔اس کے برخلاف گھمنڈی اور مغرور ظاہراً توبہ تو کرتا ہے لیکن اپنی غلطی پر سرے سے نادم نہیں ہوتا ۔چنانچہ معافی کی شرط شیطان کے لیے خدا نے جب یہ رکھی کہ زندگی میں تو آدمؑ کو سجدہ نہ کیا، کم از کم اب ان کی قبر کو سجدہ کر لے تو نجات ہو سکتی ہے ۔تب شیطان نے موسیٰؑ سے کہا کہ جس کو زندگی میں سجدہ نہ کیا اب اس کی قبر کو کس طرح کر سکتا ہوں یہ محض غرور و تکبر کی علامت ہے جو خدا کو پسند نہیں۔

(ایک اور قسط)

۲۳- فروری ۱۹۸۸ء

حضرت آدمؑ کے بیٹے حضرت شیثؑ کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں ملتا۔ البتہ حضرت ادریسؑ کا ذکر سورہ مریم کی ایک آیت میں ملتا ہے جس میں کہا گیا کہ ان کا مرتبہ بلند کیا گیا۔ نبیوں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے۔ بعض کہتے ہیں دو لاکھ چوبیس ہزار۔ اب صحیح تعداد صرف خدا جانتا ہے۔ ان میں سے صرف چند مشہور پیغمبروں کے حالات قرآن نے بتائے جو سبق آموز، فکر انگیز اور اہم ہیں۔

حضرت ادریسؑ وہ پہلے نبی ہیں جنھوں نے کپڑوں کے سینے اور کپڑا بننے کی طرف قوم کی توجہ مبذول کروائی علم نجوم، علم جفر اور علم رمل کا حقیقی علم خدا نے آپ کو عطا کیا تھا جن کے منضبط قوانین، ضابطے اور قاعدے صحیح اور اٹل تھے۔ اس کے بعد خدا نے یہ علم اٹھالیا۔ اب جو علم نجوم وغیرہ کی حیثیت ہے وہ محض ایک اندازہ اور قیاس ہے۔ اسی لیے شریعت محمدی صلعم میں ان علوم کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

کسی زمانے میں ایک بادشاہ کا قصہ ہے جو اپنے شہزادے کو علم نجوم کی طرف مائل کرتا ہے اور اس دور کے مشہور اور بزرگ منجم کے ہاں تعلیم دلواتا ہے۔ جب تحصیل مکمل ہو جاتی ہے یعنی شہزادے کی تعلیم پوری ہو جاتی ہے تو بادشاہ بہ خاطر امتحان استاد اور شاگرد دونوں کو محل میں طلب کرتا ہے اور اپنی بند مٹھی آگے کر کے کہتا ہے کہ:

"کہو شہزادے! اس میں کیا ہے؟"

شہزادہ علم کے آنکڑے ملاتا ہے۔ قواعد اور ضابطوں سے رجوع ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ میں چکی کا پاٹ ہے۔

بادشاہ مسکراتا ہے اور کہتا ہے کہ شہزادے کیا تم باولے ہوگئے ہو۔ چکی کا پاٹ بھلا کس طرح میرے اس مختصر سے ہاتھ میں سمایا جاسکتا ہے اور غضبناک ہوکر استاد سے مخاطب ہوتا ہے کہ آپ نے اسے کچھ بھی نہیں سکھایا۔ ساری محنت اکارت گئی۔

استاد جواب دیتا ہے "دیکھئے عالم پناہ! یہ علم اتنا ٹھوس اور اٹل نہیں کہ بات کو حق بیان کرے۔ یہ صرف اندازے بتاتا ہے۔ چنانچہ علم کے زور پر شہزادے نے ٹھیک اندازہ قائم کیا کہ آپ کے ہاتھ میں ایک گول شئے ہے جس میں سوراخ ہے۔ اب شہزادے نے اپنی کمزور عقل کے ذریعہ اسے چکی کا پاٹ قرار دیا جو کہ ایک غلط اندازہ تھا۔ اس موقع پر اسے چاہیئے تھا کہ عقل سے کام لیتا اور صحیح نتیجہ پر پہنچتا۔"

دراصل بادشاہ کے ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔ جو کہ گول تھی اور اس میں سوراخ یا ہالہ تھا اس لیے شریعت میں علم نجوم، جفر اور رمل کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ٥٥

توحید

(مولانا محمد مکی حجازی)

(جو پہلی مرتبہ ہندوستان تشریف لائے)

۳۱۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء سہ شنبہ

مولانا نے فرمایا کہ ان کی زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ انہیں کسی کمرے میں تقریر کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔ موصوف کا اظہار حیرت عجیب تھا۔ مزید فرمایا کہ مکہ میں وہ سات سال کی عمر سے تقریر کر رہے ہیں اور اس وقت ماشاء اللہ پچاس سال کے ہیں لیکن کبھی کسی کمرہ میں تقریر نہیں کی گئی۔ کمرے میں میٹنگ ہو سکتی ہے۔ بحث مباحثہ ہو سکتا ہے۔ فلسفیانہ گتھی سلجھائی جا سکتی ہے مگر تقریر نہیں کی جا سکتی۔ مزید کہا کہ مختلف لوگوں کے مختلف طبائع ہوتے ہیں کمزوریاں ہو سکتی ہیں وغیرہ۔ اب چونکہ میں مہمان ہوں اور سید جمیل الدین صاحب نے مجھے یہاں ٹھیرایا ہے، کھلایا ہے اس لیے یہ ناشکری اور بداخلاقی ہوگی کہ میں بغیر کچھ کہے یہاں سے اٹھ جاؤں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میں والسلام کہہ کر نکل گیا ہوتا۔ پھر مولانا نے برقی پنکھے بند کروا دیئے کہ انہیں شاید اس کی بے چینی تھی۔

فرمایا کہ اس وقت تقریر تو نہیں صرف دو ایک باتیں "توحید" سے متعلق عرض کروں گا تاکہ خدا انہیں ہمارے دلوں میں جما دے۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ (ترجمہ: نہیں ہے کوئی معبود برحق سوائے اللہ کے۔ محمد صلعم اس کے رسول ہیں)۔ کلمہ میں الہ کا لفظ خاص ہے۔ اس کی جگہ خدا کی کسی اور صفت کو استعمال نہیں کیا گیا کہ (ساری) صفات اس میں ضم ہیں

توحید عقیدہ فطرت ہے۔ اگر کسی نوزائیدہ بچہ کو کسی جنگل میں چھوڑ دیا

جائے جہاں کوئی انسان نہ ہو جو اسے تعلیم دے سکے تب بھی وہ اپنے فطری احساسات اور مطالعہ قدرت کی بناء پر خدا کے ایک ہونے کو تسلیم کرے گا لیکن محض خدا کو ایک ماننا توحید نہیں ۔ نہ نماز پڑھنا توحید ہے اور نہ سجدہ کرنا توحید ہے بلکہ سوائے خدا کے کسی اور کو ایک نہ ماننا توحید ہے اور سوائے خدا کے کسی اور کو سجدہ نہ کرنا توحید ہے ۔ کافران قریش اور ابو جہل بھی خدا کو ایک مانتے تھے مگر اپنے باپ دادا کے مذہب کو چھوڑنے کے لیے ہر گز تیار نہیں تھے ۔

دیکھا گیا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ بعض مرتبہ بات کہے بغیر بھی بات سمجھ میں آجاتی ہے اور بعض مرتبہ برسوں سمجھایا جائے تب بھی بات سمجھنا محال ہو جاتا ہے ۔

ایک کافر کا واقعہ کہ وہ حضور صلعم سے ملاقات کے لیے نکل پڑا ۔ راستے میں ابو جہل نے دریافت کیا کہ کدھر جا رہے ہو اور مقصد کیا ہے ؟ کہا گیا کہ "میں نے سنا ہے یہاں ایک نبی آیا ہے اس لیے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں دیکھنا چاہتا ہوں بات کرنا چاہتا ہوں ۔"

ابو جہل نے تمسخر کرتے ہوئے منع کیا لیکن وہ بضد ہوا ۔ چنانچہ حضور صلعم کی مجلس میں آکر کھڑا ہو گیا ۔ حضور صلعم پر جو نہی نظر پڑی اس کی دنیا بدل گئی ۔ تھوڑی دیر تک بس دیکھتا ہی رہا ۔ پھر آگے بڑھ کر آپ کے دست مبارک پر ایمان لے آیا اور حضور صلعم نے اسے کلمہ پڑھایا لیکن کوئی اور کلام نہیں کیا ۔ واپسی پر ابو جہل سے دوبارہ مڈبھیڑ ہوئی اور اس نے سارا ماجرا سنایا ۔ مزید کہا کہ میں نے کوئی کلام نہیں کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا مقدس چہرہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا واللہ ایسا چہرہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا ۔ خدا کرے کہ کم از کم ہمیں زیارت فی المنام نصیب ہو کہ حضور صلعم کا دیدار خواب میں نصیب ہو (درود پڑھنے کے لیے کہا گیا) ۔

اس کے برخلاف یہ واقعہ کہ ابو جہل اپنے ہاتھ میں کنکریاں لیکر آتا ہے اور حضور صلعم سے ایمان لے آنے کی یہ شرط لگاتا ہے کہ وہ پہچانیں کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا جو چیز تیرے ہاتھ میں ہے اگر وہ ہی کہہ دے کہ میں کون

ہوں تو کیسا رہے؟

اس نے کہا یہ تو انتہا ہو گی۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ تیرے ہاتھ میں کنکریاں ہیں۔ پھر ہاتھ کھلنے پر کنکریوں نے کلمہ پڑھا لیکن ابو جہل یہ کہہ کر چل دیا کہ تو جادوگر ہے۔۔۔ایمان کیا خاک لاتا؟

قلب کے میلان، جھکاؤ اور توجہ کے تعلق سے مثال دی گئی کہ کسی نل کے نیچے گلاس اگر اوندھا رکھا جائے تو ایک بھی قطرہ پانی کا گلاس میں سما نہ سکے گا چاہے کئی دنوں تک گلاس اسی انداز میں رکھا جائے۔اسی طرح مجلس میں سامعین جب تک اپنے دل کے پیالے کو سیدھا نہ رکھیں، خدا کی بات دل میں کیسے اترے گی؟ یہی وجہ ہے کہ عدم توجہ کے باعث زندگی بھر عبادات کی جاتی ہیں لیکن اثر نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں جلائے جانے کا واقعہ کہ ایسے ہولناک اور نازک وقت میں خدا نے فرشتوں کو ابراہیمؑ کے پاس بھیجا حتیٰ کہ جبرئیل بھی آئے اور کہا کہ اگر ہماری مدد آپ کو منظور نہیں تو کم از کم خدا سے دعا تو کیجیے۔اس میں کیا امر مانع ہے؟ آپ نے جواب دیا" خدا نہیں جانتا کہ یہ آگ کیوں لگائی گئی ہے؟ اور کس لیے جلائی گئی ہے؟ جب وہ جلانے پر راضی ہے تو میں بھی جلنے پر راضی ہوں۔ پھر دعا کس لیے مانگوں؟

یہ ہے توحید۔ اصل بات یہ ہےکہ پکا موحد کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ نہ نوری مخلوق سے نہ خاکی مخلوق سے۔ کہا گیا کہ قیامت میں سب سے پہلے لباس حضرت ابراہیمؑ کو پہنایا جائے گا کہ دنیا میں انہی کے کپڑے سب سے پہلے اتارے گئے۔

سورہ فیل کا واقعہ: عبد المطلب اور ابرہہ کے درمیان مکالمہ جب وہ اپنے اونٹ واپس لینے کے لیے ابرہہ کے پاس پہنچے۔ عبد المطلب نے کہا کہ میں اونٹوں کا مالک ہوں اس لیے اونٹ مانگنے آیا ہوں۔ کعبہ خدا کا گھر ہے اس کی حفاظت وہی کرے گا۔ چنانچہ پرندوں کو علم خدا نے دیا کہ ہاتھیوں کو مار گراؤ۔

دنیا میں پتہ بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ وہ جسے چاہے علم دے جسے

چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔اس کی حکمت وہی جانے ۔۔ بعض اوقات کسی معاملہ میں وہ نبی کو بھی لاعلم رکھتا ہے ۔چنانچہ سلیمانؑ کے ہدہد کا واقعہ کہ وہ سلیمانؑ کی نظروں سے غائب تھا جس پر وہ برہم تھے لیکن خدا نے اسے ملکہ سبا کے ہاں روانہ کیا تھا جو سورج کی پرستش کرتی تھی اور اس کی قوم بھی۔

غور کیا جائے کہ بوقت نکاح عورت اور مرد کے درمیان ایجاب و قبول کے ذریعہ تاحیات ساتھ نبھانے کا معاہدہ کیا جاتا ہے ۔اگر بالفرض بیوی اپنے شوہر کی (اور آگے چلکر) اپنی اولاد کی ٹھیک ٹھیک خدمت کرے اور کوئی شکایت کا موقع نہ دے لیکن کبھی کبھار کسی غیر مرد سے ناجائز تعلقات رکھے تو کیا شوہر اسے گوارا کرے گا ؟ ہرگز نہیں ۔نوبت طلاق کی آئے گی اگرچیکہ وہ غیر آدمی شوہر کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو اور چاہے اختلاط ایک ہی بار کیوں نہ ہوا ہو، ہر حال میں شوہر اسے برداشت نہیں کرے گا۔ پھر کس طرح کلمہ طیبہ پڑھ کر ایک مسلمان شرک کر سکتا ہے ؟اور کیونکر خدا اسے معاف کرے گا ؟اس لیے ہر قسم کے شرک سے بچنے کی ضرورت ہے خصوصاً شرک خفی سے جو نامعلوم طریقہ سے ہماری توحید کا ستیاناس کر جاتا ہے ۔OO

▲▲

تفسیر آیت قرآنی

(علامہ مفتی سید احمد پالن پوری)
استاد حدیث دار العلوم دیو بند

۲۱ جون ۱۹۸۷ء یکشنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
انا عرضنا الامانۃ ...... ظلوماً جھولاً ○ (سورہ احزاب ع ۹)

ترجمہ: (ارشاد ربانی ہے کہ ہم نے امانت آسمان پر، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی مگر ان سب نے انکار کیا اور ڈر گئے لیکن انسان اس کو اٹھالیا۔ وہ ظلم کرنے والا نادان ہے۔

اس آیت میں انسان کے ماسوا دیگر مخلوقات نے جو انکار کیا وہ ان معنوں میں نہیں کہ خدا کے حکم کو معاذ اللہ ٹھکرا دیا یا اس کے حکم عدولی کی جیسا کہ ابلیس نے حضرت آدمؑ کے سجدہ کے وقت انکار کیا تھا بلکہ سبھوں نے اس امانت کی ذمہ داری کو نبھانے میں خود کو اس کا اہل اور مکلف نہیں سمجھا یعنی خود کو مجبور و معذور جان کر روگردانی اختیار کی اور خوفزدہ ہوئے لیکن اس منصب کو انسان (آدمؑ) نے قبول کیا اور خود آگے بڑھکر یہ ذمہ داری اپنے سر لی۔ اسی لیے وہ اشرف المخلوقات کہلایا۔ یہ اشرفیت یا افضلیت انسان کو اس کے قد، وزن یا دیگر حواس خمسہ کے تصرف کی بنیاد پر نہیں دی گئی کیونکہ کائنات میں ایسی کئی مخلوقات موجود ہیں جو قد، وزن اور دیگر حواس کے اعتبار سے انسان سے ارفع اور بلند ہیں بلکہ یہ درجہ اور رتبہ انسان کو اس کی قابلیت، صلاحیت، حکمت اور دانائی کی بناء پر دیا گیا جس کی بابت ایک جگہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ہم نے جو اپنی خلافت یا

نیابت انسان کو دنیا میں دینی چاہی ہے۔اس امر سے تم لوگ ابھی واقف نہیں ہو۔
چنانچہ جب دنیا کی کئی اشیا کو حضرت آدمؑ کے روبرو رکھا گیا اور پہلے فرشتوں سے سوال
کیا گیا کہ بتاؤ ان اشیا کے نام اور کام کیا ہیں؟ تب فرشتوں نے بالکل لاعلمی ظاہر کی۔
اس وقت آدمؑ نے ان تمام کی تشریح فرمائی اور ان کے کاموں کا تعین بھی فرمایا....
یہاں یہ بھی خلاصہ ہو جاتا ہے کہ جب فرشتوں نے کہا تھا کہ "اے خدا! تو ایک ایسی
ہستی کو اپنا خلیفہ کیوں بنانا چاہتا ہے جو دنیا میں ہنگامہ برپا کرے گی اور فساد مچائے گی
جبکہ ہم تو ہر دم تیری عبادت اور حمد و ثنا میں موجود و حاضر ہیں۔"

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایسا کوئی باقاعدہ عہد و
پیمان انسان اور دیگر مخلوقات کے درمیان نہیں ہوا بلکہ آیت کا خلاصہ و مفہوم یہ ہے
کہ انسان کے سوا دیگر مخلوقات نے اس امانت کو اٹھانے کا خود کو مکلف نہیں سمجھا
اور انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا۔

"امانت" سے یہاں مراد خدا کا دین، خدا کے احکامات اور اس کی شریعت ہے۔
یہاں امانت کا لفظ بطور خاص استعمال کیا گیا ہے اور کتاب یا احکام جیسے الفاظ کو رد
کیا گیا ہے اس لیے کہ امانت ایک قیمتی اور قابل قدر شے ہوتی ہے جو امانت دار کو
آزمائش و امتحان کے لیے سونپی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ دیکھنے کے لیے کہ انسان کس حد
تک امین (امانت والا) قرار پاتا ہے یا خائن (خیانت کرنے والا)، یہ امانت اس کے
سپرد کی گئی۔

یہ بات غور طلب ہے کہ ہر انسان اشرف المخلوق ہو، یہ ضروری نہیں۔ بلکہ
خیانت کرنے والے یعنی شریعت کی ذمہ داری کو پوری طرح نہیں نبھانے والے یا
سرے سے انکار کرنے والے دراصل اسفل السافلین یا ارذل ترین مخلوق ہیں جو
حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔ اسی لیے آیت کے ٹکڑے میں جو انسان کو "ظالم" اور
"جاہل" کہا گیا ہے وہ ایسے ہی انسانوں سے عبارت ہے۔ ورنہ اس کے برعکس جو
انسان امین ہیں یعنی شریعت کی ذمہ داری کو پوری طرح نبھانے والے ہیں وہ "عادل

اور "عالم" ہیں اس کا اشارہ قرآن میں نہیں دیا گیا مگر غور کرنے پر اس کی وضاحت از خود نکل آتی ہے ـــــ حیوانات، نباتات، جمادات یا فلکی اشیاء وغیرہ وغیرہ میں کی کسی شہ کو عادل یا عالم اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں انصاف کرنے کی یا علمیت جذب کرنے کی مطلق صلاحیت نہیں ـ یہ سب صلاحیتیں حضرت انسان کو دی گئیں حتیٰ کہ فرشتے بھی اس سے مبرّیٰ ہیں کیونکہ وہ تو ہر آن خدا کی بندگی اور حمد و ثنا میں مصروف ہیں ـ

ایک حدیث کے مضمون میں ہے کہ قیامت کے دن تمام مخلوقات کے ساتھ انصاف ہوگا اور فیصلہ ہوجانے کے بعد انسان کے ماسوا دیگر مخلوقات کو خاک کر دیا جائے گا یعنی ان کے لیے حکم ہوگا کہ مٹی ہو جاؤ، اس وقت انسان حسرت سے کہے گا کہ کاش یہ حکم اس کے لیے بھی ہوتا تاکہ حساب کتاب اور جزا و سزا سے نجات مل جاتی .... لیکن ایسا نہیں ہوگا ـ انسان کو بہر حال اپنے کیے کا بھگتنا پڑے گا ـــ اسی حدیث میں یوں بھی ہے کہ دنیا میں اگر ایک سینگ والی بکری کسی بغیر سینگ والی بکری کو مارے گی تو بروز حشر بغیر سینگ والی بکری کو سینگ دیئے جائیں گے اور سینگ والی بکری سے سینگ چھین لیے جائیں گے اور اسے حکم ہوگا کہ دنیا کی مار کا بدلہ یہاں لے لے ـ یعنی قیامت میں حق والے کو حق دلایا جائے گا ـ

بحث کی وضاحت کے لیے اب انسان کے دو بنیادی گروہ اور ایک درمیانی گروہ قرار دیا جاسکتا ہے ـ

(۱) مومن مرد اور مومن عورتیں: جو اس امانت کو بخوبی نبھائیں گے اور جن کے لیے انعام اور ابدی راحتیں ہیں ـ

(۲) مشرک مرد اور مشرک عورتیں: جو اس امانت کو بالکل نہین نبھائیں گے اور جن کے لیے دردناک عذاب اور ابدی تکالیف ہیں ـ

(۳) منافق مرد اور منافق عورتیں: جو ظاہراً یعنی زبان سے دین کا اقرار کریں لیکن دل ایمان سے خالی ہوں یہ بھی گنہگار ہیں اور عذاب و سزا کے مستحق ہوں گے ـ

اس تیسرے گروہ میں بھی مزید ذیلی تقسیم کی جاسکتی ہے یعنی:
(ا) وہ جو نفاق اعتقادی رکھتے ہوں یعنی لمان کا اقرار زبان سے ہو گا اور دل سے انکار ہو گا لیکن عمل پر کار بند ہوں گے۔ یہ بھی سخت سزاوار ہوں گے۔
(ب) وہ جو نفاق عملی رکھتے ہوں یعنی دل و زباں دونوں سے دین کا اقرار تو کریں گے لیکن عمل پر کار بند نہ ہوں گے۔ یہ بھی مستحق عذاب ہوں گے۔

امانت کی ذمہ داری کو نبھانے والی بات انسان کو نہ صرف بذات خود اٹھانی ہے بلکہ اپنے دائرہ اثر میں بھی چلانی ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ کسی انسان کا دائرہ اس کی ذات تک ہی محدود ہو (جبکہ وہ مجرد اور تنہا ہو) یا کسی کا اثر اپنے اہل و عیال تک ہو یا کسی کا محلہ یا شہر یا کسی ملک تک ہو۔ علی ہذا القیاس۔ بہر حال یہ بوجھ اپنی ذات کے علاوہ اپنے اس دائرہ کے لیے بھی ہے جو اس کے زیر اثر ہو۔

کلمہ طیبہ کے مفہوم میں مولانا نے کہا کہ یہ کلمہ نہ صرف خدا کو ایک ماننے اور محمد صلعم کو رسول ماننے کی حد تک ہے بلکہ اس میں یہ بات بھی موجود ہے کہ خدا کے رسول عربی جو سچے پیغام بر ہیں ان کا وہ سچا پیغام جو خدا کی طرف سے انہیں عطا کیا گیا ہے اس پر عمل کرنے کا بھی اقرار اس کلمہ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔

آگے چلکر مولانا نے خطبہ میں ایک حدیث کے حوالے سے یہ فرمایا کہ ہر بچہ دین فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماںباپ اسے کافر یہودی یا نصرانی یا دیگر مذہب کا بنا دیتے ہیں۔ گویا کہ ماحول کے اثرات سے بچہ دین فطرت سے علحدہ کر دیا جاتا ہے اور ماحول کے رنگ میں رنگ دیا جاتا ہے ورنہ فطری طور پر وہ دین فطرت پر گامزن ہوتا ہے۔

حالات حاضرہ کے تحت مولانا نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں یا کسی بھی ملک میں (کیونکہ ساری دنیا خدا کی ملک ہے) با امن اور باعزت رہنا ہے تو پہلے مسلمانوں کو مسلمان ہونا پڑے گا یعنی ایک حدیث کی رو سے انہیں آپس میں بھائی بھائی کا نمونہ بن کر دکھانا ہو گا۔ حدیث میں اس کی مثال ایک

جسم کی دی گئی ہے کہ بالفرض اگر پاؤں پر سخت چوٹ آجائے تو سارے اعضا متاثر اور پریشان ہوجاتے ہیں۔ آنکھ یہ نہیں کہتی کہ کیوں میں اپنی نیند حرام کروں اور پاؤں کی خاطر آب دیدہ ہوجاؤں یا دماغ یہ نہیں کہتا کہ مجھے آرام کرنے دو، تمہارا گھاؤ تم خود بھرلو ۰۰۰۰ یا بخار آجائے تو صرف پاؤں کو بخار نہیں آتا بلکہ پورا جسم متاثر ہوتا ہے ۰۰۰۰ اسی طرح مسلمانوں کو بھی آپس میں اتحاد اور اتفاق کی ایسی عمدہ نظیر قائم کرنی چاہیئے کہ ایک علاقہ میں کوئی مسئلہ مسلمانوں کے لیے پریشان کن ثابت ہو تو دیگر علاقوں کے مسلمانوں میں ہل چل مچ جانی چاہیئے اور اس کے لیے تڑپ اور بے قراری ہونی چاہیئے۔ یہ حمیت اور احساس کا سوال ہے۔

"قیام اتحاد" کے مضمون کے بعد مولانا نے جن دو اہم باتوں کی طرف پرزور اشارہ دیا وہ تھیں: (۱) مال اور (۲) علم

مال کے متعلق مولانا نے کہا کہ مال سے ان کی مراد وہ دولت نہیں جو مسلمانوں کے ذاتی تصرف میں لائی جائے یا ان کی جیبوں یا تجوریوں میں محفوظ رہے یا خزانوں کی صورت میں مدفون ہو۔ بھلا ایسے مال سے "ملت" کو کیا فائدہ ہے یا ہوسکتا ہے؟ مال وہ ہے جو ملت کی خدمت و بھلائی کے لیے پس انداز کیا جائے۔ قرآن کے حوالے سے کہا کہ مال آسرا ہوتا ہے جبکہ خدا سے غافل نہ کرے ورنہ ایسا مال وبال ہے جس کی حرص و طمع میں آدم سب کچھ بھلادے۔

مولانا نے عبرت کے لیے قادیانوں کی مثال دی (اگرچیکہ یہ گمراہ کن فرقہ گمراہی پھیلانے کے لیے اپنی بھرپور کوشش میں لگا ہوا ہے اور اس فتنہ کو از سر نو ہوا دینے کے لیے سر اٹھا رہا ہے) واضح ہو کہ مولانا "تحفظ ختم نبوت" کی تنظیم کے جنرل سکریٹری ہیں اور اس تحریک کو قادیانوں کے خلاف چلانے میں موصوف نے بڑی بے جگری سے کام لیا ہے۔

مولانا نے کہا کہ ہر قادیانی پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی سالانہ کمائی کا ایک چوتھائی حصہ مرکز کو روانہ کرتا ہے اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو ساٹھ تا ستر

فیصد کمائی کا حصہ بھی نذر کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ انہیں قبرستان میں جگہ ملے گی جسے وہ جنت سے تعبیر کر کے ان کے عقیدہ کے مطابق جنتی کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔خدا جانے یہ کونسی دوزخ نما جنت ہے؟

مولانا نے مزید کہا کہ حال ہی میں جب وہ تحفظ ختم نبوت کے جلسوں کی شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے تو اس موقع پر قادیانی لٹریچر کو بڑے شدومد کے ساتھ مفت میں گھر گھر تقسیم کیا گیا۔جن کی طباعت و اشاعت اتنی عمدہ اور شاندار تھی کہ سوچنا پڑتا تھا کہ آخر یہ سرمایہ اور مال کہاں سے آیا؟ ظاہر ہے یہ سب دین مرکز کی جمع شدہ رقم کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تھا گمراہ کن جماعت کا حال۔۔۔جبکہ "حق جماعت" کی اشاعت کے لیے مرکز میں سرمایہ ناکافی ہے۔اس لیے ہر سچا مسلمان جو حق کی دعوت کے لیے اپنا کچھ نہ کچھ مال حسب حیثیت پس انداز کرے تو یہ دینی خدمت بھی ہوگی اور ثواب جاریہ کی صورت بھی...

علم کے تعلق سے مولانا نے اس بات پر اہمیت دی کہ مسلمان کو نہ صرف "دینی علوم" حاصل کرنے چاہیں جو اس کے لیے بلاشبہ آخرت کا سامان مہیا کریں گے بلکہ دنیا میں باعزت زندگی گذارنے کے لیے "دنیوی علوم" بھی سیکھنے چاہیں ورنہ اس دارالاسباب میں زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی؟ موصوف نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں چار ہزار طلبہ کے منجملہ مسلمان طلباء صرف ڈھائی سو ہیں وہ بھی ایسے شعبوں میں جن میں محنت اور مشقت کم صرف ہوتی ہے۔مزید یہ بھی کہا کہ شہر کے ہر محلہ میں اگر دینی مراکز اور ادارے قائم ہوں تو ہر پیشہ کا مسلمان اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔کیونکہ علم حاصل کرنے کے لیے نہ تو عمر کی قید ہے اور نہ پیشہ کی۔۔۔۔اگر کوئی مسلمان بالفرض ضعیف یا موظف ہے تو اپنی حسب سہولت تعلیم بالغان میں اپنا وقت دے سکتا ہے اور اگر سرکاری ملازم ہے یا دکاندار یا تاجر پیشہ ہے یا طالب علم ہے تو شام میں اپنے اوقات نکال سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

وقت قیامت کی چال چل رہا ہے۔ایسے میں اگر ہم مندرجہ بالا تینوں باتوں پر متحد ہو جائیں تو انشاء اللہ نہ صرف وقت کا تقاضہ پورا ہو گا بلکہ دین و دنیا کی خوشحال زندگی بھی میسر ہو گی۔ OO

فقہی مذاکرہ

(مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب)

" ارم کالج " آعظم پورہ میں " فقہی مذاکرہ " کی ابتداء یکم ڈسمبر ۱۹۸۷ء (سہ شنبہ) سے ہوئی اور ہر مہینے کی پہلی منگل کو یہ سلسلہ برابر قائم ہے ۔ اس میں سوالناموں کے جوابات مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دیا کرتے ہیں ۔ اس ضمن میں یوں تو میں نے وقتاً فوقتاً کئی سوالنامے داخل کئے لیکن اس وقت چند سوالات کا انتخاب کیا گیا ہے ملاحظہ ہوں:

(پہلا سٹ)

۶ جولائی ۱۹۸۸ء

(۱) اگر کسی میاں بیوی کو چار اولادیں ہوں اور ماہانہ یافت ضروری اخراجات کے لیے قریب قریب ناکافی ہو تو کیا ایسی صورت میں شوہر یا بیوی کو فیملی پلاننگ آپریشن کی طرف رجوع ہونا چاہیئے ؟

(۲) بغیر وضو کے چلتے پھرتے یا اُٹھتے بیٹھتے اگر قرآن مجید کی آیات یا چھوٹی سورتیں دل میں یا زبان سے آہستہ پڑھیں یا ان کا ورد کریں تو اس عمل کا کیا حکم ہے ؟

(۳) فرضیت حج کے لیے کیا مسلمان کا صاحب نصاب ہونا کافی ہے یا دیگر شرائط بھی ضروری ہیں مثلاً: ۔ حج کا ضروری خرچ پاس ہو یا حج کی واپسی تک اہل و عیال کی کفالت اس کے ذمہ ہو یا جملہ قرض سے وہ بے باق ہو وغیرہ اس کی صراحت فرمائیں ؟

......

جوابات: (۱) مالی تنگی کی بناء پر فیملی پلاننگ آپریشن (عارضی یا مستقل) کی طرف رجوع ہونے کا اسلام میں کوئی جواز نہیں ہے۔ صرف صحت اور طبی نقطہ نظر سے عورت کی جان کو خطرہ ہو تو اس کا جواز مل سکتا ہے۔

(۲) پڑھ سکتے ہیں۔ صرف حالت جنابت میں جبکہ غسل واجب ہو کلام پاک کی تلاوت نہیں کی جاسکتی۔ نکتہ یہ ہے کہ کلی کرنا غسل میں فرض ہے اور حالت جنابت میں یہ گویا ناپاک ہوتا ہے یعنی دہن۔ تو کس طرح ناپاک منہ سے پاک کلام ادا کیا جاسکتا ہے؟۔۔۔ وضو میں ہاتھوں کا دھونا فرض ہے۔ بغیر وضو کے گویا ہاتھ ناپاک ہوتے ہیں اس لیے بلا وضو کلام پاک کو چھوا نہیں جاسکتا کلی کرنا وضو میں فرض نہیں ہے۔ اس لیے بلا وضو کلام پاک کی تلاوت کی جاسکتی ہے۔

(۳) صاحب نصاب ہونا زکواۃ اور صدقہ فطر کے لیے واجب ہے نہ کہ حج کی فرضیت کے لیے۔۔۔ اگر اتنی رقم موجود ہو کہ حج کا سفر کیا جاسکتا ہے اور حج کی واپسی تک اہل و عیال کی کفالت کی جاسکتی ہے اور قرض سے بے باق ہے تو اس شخص پر حج فرض ہے۔ اب یہ رقم چاہے روپیوں کی شکل میں ہو یا جائداد مکان وغیرہ کی شکل میں یا زیورات کی شکل میں ہو۔ مثلاً۔ اگر کسی کا ایک رہائشی مکان ہو اور ایک کرایہ پر دیا گیا ہو اور کرایہ کا مکان فروخت کرنے سے حج کی ادائیگی ہو سکتی ہے تو اس پر حج فرض ہے۔

(دوسرا سٹ)

۶ جولائی ۱۹۸۸ء

(۱) حضور اکرم صلعم کا غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک پیش نظر رکھتے ہوئے کیا آج کے دور میں ہم مسلمانوں کو بھی اس کی تقلید ضروری ہے جبکہ ملازمتوں میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے یا خدا کا دشمن ہمارا بھی دشمن کے مصداق غیر مسلم سے قطع تعلق بہتر ہے؟

(۲) عبادات میں طبیعت پر گرانی نفس کے خلاف مجاہدہ ہے۔ کیا یہ درجہ اس حالت سے افضل ہے جس میں عبادات بجالاتے وقت طبیعت میں حلاوت یا خشوع و خضوع پیدا ہو؟

(۳) اپنی محدود آمدنی کے باعث کوئی مسلمان اگر آئے دن سودی قرض یا رہن میں مبتلا ہو تو اس سے بچنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی خاص دعا کارگر ثابت ہوگی؟ بیان فرمائیں۔

•••••

جوابات: (۱) حضور صلعم کا حسن سلوک غیر مسلموں کے ساتھ بہتر رہا ہے اس لیے ہمیں بھی اس سنت کو اختیار کرنا چاہیے۔ ان سے قطع تعلق ٹھیک نہیں۔ البتہ مرتد سے قطع تعلق کیا جانا چاہیے جو اسلام سے پھر گیا ہے۔

تعلقات یا سلوک کی تین صورتیں ہیں:

(۱) غیر مسلموں کے ساتھ عام حالات میں عزت و دعوت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔

(۲) غیر مسلموں کی مالی اعانت و مدد بھی کی جاسکتی ہے۔

(۳) ان کی مذہبی رسومات میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے بھگوان کی پوجا پر چڑھائی گئی کوئی چیز نہ کھانا چاہیے نہ قبول کرنا چاہیے۔ نہ ان کے مذہبی تہواروں میں شریک ہونا چاہیے۔ البتہ شادی بیاہ و دیگر غیر مذہبی رسومات میں شرکت کی جاسکتی ہے

(۲) یہ سوال تصوف سے متعلق ہے جس میں بعض علماء خشوع و خضوع کے مرتبہ کو افضل سمجھتے ہیں لیکن اکثر صوفیاء پہلے درجہ کو یعنی نفس پر گرانی کے درجہ کو افضل مانتے ہیں۔

(۳) سودی قرض وغیرہ سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ دعا یہ ہے جو آزمودہ ہے:

اللھم انی اعوذ بک من الھم والحزن و اعوذ بک من العجز والکسل واعوذ بک من البخل و الجبن واعوذ بک من غلبة الدین و قھر الرجال ○

(تمیراسٹ)

۲۸ ستمبر ۱۹۸۸ء

(۱) اکثر مساجد میں خصوصاً بعد نماز فجر دعا کے اختتام پر امام صاحب "الفاتحہ" علی الا علان کہتے ہیں اور فاتحہ پڑھنے کا مقتدیوں کو پابند کرتے ہیں اور اس میں شریک نہ ہونے والوں پر ملامت کی جاتی ہے براہ کرم اس مسئلہ کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالیں؟

(۲) قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلام و ایمان کی حیقیت سمجھنے، علم و عمل کا صحیح جوڑ پانے او معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لیے جیسا کہ مشہور ہیکہ کسی شیخ کامل یا سچے مرشد کی ضرورت ہے تو ناچیز اس بات کا متمنی ہے کہ فی زمانہ چند کاملین کے نام اور پتے درج کروائے جائیں تاکہ اس راہ میں صحیح نشاندھی و رہنمائی ہوسکے؟
(۳) ایمانیات اور عقائد کی تمام باتوں کا کامل یقین دل میں کیونکہ پیدا کیا جاسکتا ہے؟ اس کی کیا تدابیر ہو سکتی ہیں؟ جبکہ یہ یقین ایمان کی عین اور اہم شرط ہے۔

•••••••

جوابات: (۱) یہ بدعت ہے۔ درست نہیں (۲) یہ ضرورت دین سے لازم تو نہیں البتہ مباح ہے کہ مسلمان کسی شیخ یا مرشد سے بیعت کرے لیکن قبر میں یا قیامت میں اس کا سوال نہیں ہوگا کہ تمہارا شیخ کون تھا؟ اب یہ مزاج اور ذوق پر منحصر ہے کہ کس مزاج و ذوق کا شیخ منتخب کیا جائے؟ کسی سنت کے پابند استاد یا عالم کو چنا جائے جو صحیح رہنمائی کرسکے۔ بے شک ایسا عالم مربی، مصلح اور استاذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو قرآن و سنت کا عالم بھی ہو اور اس پر عمل کرنے والا بھی ••• چند نام یہ ہیں (جنہیں بعد ختم مجلس لکھوایا گیا)

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ندوۃ العلماء لکھنو

(ب) حضرت مولانا مسیح اللہ خاں مدرسہ مفتاح العلوم۔ جلال آباد ضلع مظفرنگر

(ج) حضرت مولانا محمد صدیق باندوی جامعہ عربیہ ہتھوڑہ ضلع باندہ (یو۔پی
(د) حضرت مولانا انعام الحسن صاحب مرکز نظام الدین۔دہلی

(۳) "تذکیر" یعنی بار بار خدا کا ذکر کرنے سے ایمان دل میں اترتا ہے۔اس لیے روزانہ تلاوت قرآن کا معمول رکھنا چاہیے۔قرآن میں انبیاء کے قصص و واقعات بھی اسی لیے ہیں کہ ان واقعات سے بات دل و دماغ میں بیٹھتی ہے۔قرآن محض قصوں کی کتاب نہیں بلکہ سراپا "ہدایت" ہے اس ضمن میں صحابۂ اکرام کے واقعات اور سیرت النبی صلعم کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ یہ بات عقائد و ایمان کو دل میں جماسکے۔دو کتابیں مطالعہ کے لیے مفید ہیں:

(ا) حیاۃ الصحابہ (مولانا محمد یوسف رح کاندھلوی)

(ب) اسوۂ صحابہ (مولانا عبد السلام ندوی)

•••••••

(چوتھا سٹ)

۳۔اکتوبر ۱۹۸۸ء

(ا) "آیات متشابہات" کے بارے میں کیا حضور صلعم کی بیان کردہ تفسیر و تشریح کا ذخیرہ موجود نہیں ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ مختلف علماء و مسلمان اکثر و بیشتر "آیات متشابہات" کے مختلف مطالب بیان کرتے ہیں یا ان میں مختلف تاویلات کی راہ نکالتے ہیں۔

(۲) دین اسلام جب مکمل ہے تو پھر "اجتہاد" کی ضرورت کیوں؟

(۳) براہ مہربانی بیان فرمائیں کہ مسلمانوں کے لیے بابری مسجد سے متعلق اجودھیا مارچ کیا صحیح اقدام ہوگا؟

جوابات : (۱) "آیات متشابہات" ان کو کہتے ہیں جن کے ایک تو معنی معلوم نہ ہوں جیسے حروف مقطعات الم، الر، یسین وغیرہ ـــــ دوسرے مفہوم و کیفیت معلوم نہ ہو جیسے قرآن میں خدا کے عرش پر بیٹھنے کو بیان کیا گیا ہے۔ اس پر انسان اپنی بیٹھک کا اگر قیاس کرے تو وہ غلط ہوگا کیونکہ خدا اعضا کا محتاج نہیں۔ اس میں علماء و فقہاء کے دو گروہ ہیں ایک تو ان میں کھوج کا قائل نہیں۔ صرف ایمان لانے پر دلالت کرتا ہے دوسرا جستجو کی تلقین کرتا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے چیلنج ہے جن میں علمی بصیرت، فہم و فراست کی اٹھان ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان متشابہات کے بارے میں حضور صلعم نے تشریح نہیں فرمائی جبھی تو یہ متشابہات کہلائے۔ اس کے مقابل "محکمات" ہیں یعنی وہ آیات جن میں شریعت کے واضح احکامات ہیں جن کا مکلف ہر عاقل و بالغ مسلمان ہے (مرد ہو یا عورت)

(۲) اسلام کے اصول اور قوانین اٹل اور متعین ہیں۔ لیکن "اجتہاد" کی ضرورت زمانہ در زمانہ ہوتی ہی ہے۔ جیسے فی زمانہ بینک کی رقم پر سود کا مسئلہ، فیملی پلاننگ، ٹی وی کا دیکھنا، اعضاء کی پیوند کاری، پگڑی سسٹم وغیرہ۔ اس میں مجتہدین اسلامی اصول کی روشنی میں فیصلہ و فتویٰ دیں تو مسائل حل ہوں گے۔

(۳) وقت کا یہ بڑا نازک سوال ہے۔ اسلامی غیرت ایک چیز ہے اور وقتی حکمت و فصیلہ ایک چیز ہے۔ جو قبل از وقت نہ ہو۔ جیسے بیعت رضوان و صلحہ حدیبیہ میں حضرت [illegible] کے نام پر مرمٹنے کا جذبہ حمیت و غیرت کی مثال ہے۔ حضور صلعم نے ۶ ھ میں مکہ پر حملہ موقوف کیا اور ۸ ھ میں یہ حملہ کیا گیا۔ یہ وقتی مصلحت اس بناء پر حضور صلعم نے خیال کیا کہ ابھی وقت موزوں نہیں۔

خانہ کعبہ میں ۱۹ یا ۲۰ سال تک بت پرستی ہوتی رہی مگر حضور صلعم نے اس کے خلاف کوئی علم بلند نہیں کیا اور فتح مکہ کے موقع پر خود اس کا حل نکل آیا۔ اب یہ اشارات ہیں کہ اجودھیا [illegible] مسلمانوں کے لیے بابری مسجد کے سلسلہ میں صحیح اقدام ہوگا یا نہیں غور فرمالیں۔

......

(پانچواں سٹ)

۱۳-ڈسمبر ۱۹۸۸ء

(۱) اگر ہر مذہب اپنی جگہ صحیح ہے تو اس دعوے کی کیا بنیاد اور کیا معیار ہونا چاہئے؟
(۲) بعض لوگ جو مذہبی رواداری کو مانتے ہیں۔ اکثر مذاہب کے ماننے والوں کو آپس میں ملانے کے لیے سب کو ایک جہتی اور بھائی چارگی کی تعلیم دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کس حد تک صحیح ہے؟
(۳) کبیر داس اور سائی بابا کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے اصولوں پر بھی چلتے تھے۔ کیا انہیں "صوفی" قرار دیا جاسکتا ہے؟

......

جوابات: یہ تینوں سوالات "وحدت ادیان" (یعنی تمام مذاہب کا ایک ہونا) پر مشتمل ہیں جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ تمام مذاہب کے راستے الگ الگ ہیں لیکن حقیقت ایک ہے اک حد تک صحیح ہے لیکن حقیقتاً محض خدا کو ایک ماننے سے اسلام کی تعلیمات اور عقائد پورے نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ حضور صلعم کی رسالت کا اقرار اور آخرت پر یقین بھی ضروری ہے۔ یہ حضور صلعم کا اعجاز ہے کہ آپ نے شرک کو بری طرح زائل فرمایا۔ جس کے نتیجہ میں بعض عیسائی تثلیث کے مخالف ہوئے۔ ہندو مت میں آریا سماج والے بتوں کو پوجنے کے خلاف ہوئے وغیرہ اور وحدانیت کے قائل ہوئے۔

از روئے قرآن اسلام ہی خدا کے نزدیک سچا دین ہے "ان الدین عند اللہ الا سلام" مسلمانوں میں اسلام نے اپنے امتیاز کو قائم رکھنے کی تعلیم دی کہ اپنا شعار، لباس، تہذیب وغیرہ قائم رکھیں اور دیگر مذاہب کے ساتھ "رواداری" کا حکم دیا ہے، لکم دینکم ولی دین، یعنی لین دین، سلوک وغیرہ میں حسن سلوک برقرار رکھیں۔

سائل نے کبیر داس اور سائی بابا کے ساتھ گاندھی جی اور گرونانک کا ذکر نہیں کیا ہے جبکہ گاندھی جی وحدانیت کے حد درجہ قائل تھے اور اپنے آشرم میں قرآن، بائبل گیتا اور رامائن سبھی رکھا کرتے تھے۔ اس تحریک کو بعد ازاں ونوبھا بھاوے نے چلایا لیکن یہ مسلمان نہیں کہلائے جاسکتے اس لیے کہ شرط ایمان میں حضور صلعم کی رسالت، آخرت، موت، فرشتےؑ اور قرآن پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

جزا و سزا کے لیے بعض کے ہاں "آواگان" کا نظریہ ہے کہ انسان برے کام کرے تو آئندہ جنم میں جانور بن کر آئے گا بلکہ اس سے بھی بدتر شکل میں اگر وہ بے حد برا ہے لیکن اسلام نے اس تصور کو باطل قرار دیا۔ موت کے بعد پھر پیدائش کا سوال ہی نہیں کہ وہ اس دنیا میں دوبارہ کسی اور روپ میں آئے۔ البتہ اسلام نے آخرت کا تصور دیا جہاں ہر ایک کے ہر ہر عمل کی جزا و سزا تجویز کی جائے گی۔

......

(چھٹا سٹ)

۵ جولائی ۱۹۸۸

(۱) فتوے اور تقوے میں کیا فرق ہے؟ (۲) شریعت، طریقت، تصوف، حقیقت، معرفت میں کیا فرق ہے؟

(۳) براہ کرم "صبر" کی تفصیلی تعریف و تشریح بیان فرمائیں؟

......

جوابات: (۱) فتوے اور تقوے میں فرق ہے البتہ فتوے اور مسئلے میں کوئی فرق نہیں اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ مفتی جب اپنا معاملہ دیکھے تو احتیاطی صورت یعنی تقویٰ اختیار کرے اور امت المسلمین کا معاملہ دیکھے تو سہولت پیش نظر رکھے جو فتویے کی بنیاد ہے حضور صلعم کا بھی یہی طریقہ اور سنت رہی ہے۔ تنہائی میں آپ نماز کے اندر سورہ بقرہ تلاوت فرماتے مگر باجماعت نماز میں مختصر سورتیں تلاوت کیا کرتے تاکہ

سہل اور آسانی کا معاملہ رہے۔

چاشت کی نماز آپ نے منقطع کر دی تاکہ امت اسے فرض نہ سمجھ لے۔

(۲) شریعت سے ہٹ کر اسلام میں اور کوئی جگہ نہیں ۔ دراصل اسلام میں اعتقادات عبادات، معاملات، اخلاقیات اور معاشرت کے عنوانات پر مسائل تقسیم کیے گئے ہیں خالص اعتقادات کو جن علماء نے موضوع بحث بنایا اس کو علم کلام سے موسوم کیا۔ مگر وہ شریعت سے ہٹ کر نہیں ۔اسی طرح باطنی اصلاح یا قلبی درستگی کے لیے ۔ (تصوف، طریقت، معرفت یا حقیقت) کی اصطلاحات وضع کی گئیں جو شریعت کے منافی نہیں ۔ جیسے غرور، غصہ تکبر یا طمع وغیرہ کا دور کرنا ۔ گویا کمال شریعت ہی طریقت یا تصوف وغیرہ ہے۔

جو بات یا جو کام شریعت سے ہٹ کر اسلام میں داخل کیا جائے وہ "زندیقیت" ہے یا "بدعات" ہیں ۔ان کی کوئی اصل نہیں۔

(۳) صبر کے لغوی معنیٰ ہیں برداشت کے لیکن عربی معنوں میں اور اسلامی اصطلاح میں اس کے معنی ہیں خواہشات نفسانی کے خلاف مجاہدہ اور بغاوت ـــ اگر نفس کی خواہشات پر انسان کنٹرول کر لے تو اس کے لیے دین کے تمام امور سہل اور آسان ہو جاتے ہیں ۔وہ نماز بھی عمدگی سے ادا کر سکتا ہے ۔روزوں کا اہتمام بھی کر سکتا ہے صاحب نصاب ہو تو زکواۃ کی ادائیگی بھی کر سکتا ہے اور وسعت ہو تو حج کا فریضہ بھی انجام دے سکتا ہے۔

صبر صرف اس کا نام نہیں کہ کسی عزیز یا اہل و عیال یا خاندان کے کسی فرد کے انتقال پر ماتم نہ کرے اور آنسو نہ بہائے ۔یہ تو سہل ہے۔

اندازہ لگائیے کہ اگر ناحق کوئی کسی کی بیوی پر "زنا" کی تہمت لگائے تو اس موقع پر نفس کے خلاف صبر کرنا کمال ہے جبکہ طبیعت کا تقاضا اس درجہ بڑھ جائے کہ ایسا کہنے والے کو قتل کر ڈالنے پر آمادہ ہو۔

چنانچہ حضرت عائشہؓ کا واقعہ ۔پھر سورہ نور کی آیت کا نزول جس میں خدا تعالیٰ

نے حضرت عائشہؓ کی براءت نازل فرمائی۔
اسی لیے صبر کو نماز سے پہلے قرآن میں ذکر کیا اور ایک آیت میں فرمایا کہ صبر کرنے والوں کے ساتھ خدا ہے۔

....

(ساتواں سٹ)

۶ فروری ۱۹۹۰ء

(۱) داڑھی رکھنا شرعاً واجب ہے یا سنت ہے؟ اس طرح بے ریش مسلمان کس قسم کے گناہ کے مرتکب ہوں گے؟
(۲) موذن اگر فرض نمازوں کی اقامت سے پہلے معمولاً درود شریف باآواز بلند پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟
(۳) کیا یہ صحیح ہے کہ فرض نمازوں کے بعد ہمارے ہاں جو اجتماعی دعا کا دستور ہے اس کی کوئی اصل نہیں؟ براہ کرم اس کی تائید میں مستند حوالہ نوٹ کروائیں تو مہربانی ہوگی۔
(۱) یہ خیال کہ عربوں میں داڑھی رکھنے کا عام رواج تھا اسی لیے حضور صلعم سے اسے اپنایا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔اس عمل کو بالکلیہ شرعی حیثیت حاصل ہے۔چنانچہ داڑھی رکھنا شرعاً واجب ہے حضور صلعم نے داڑھی رکھنے کی تاکید فرمائی ہے اور داڑھی نہ رکھنے پر مذمت اور تنبیہ فرمائی ہے۔اس لیے بے ریش مسلمان فسق کے مرتکب اور ترک واجب کے گنہگار قرار دیئے جائیں گے اس لیے انہیں چاہیئے کہ اپنے اس گناہ سے باز آئیں، توبہ کریں اور مستقبل میں داڑھی رکھنے کی نیت کریں۔
داڑھی رکھنا مسلمانوں کا شعار ہے اور رسول اللہ کی سنت بھی۔۔۔اس لیے اس عمل کو محبوب سمجھ کر سنت کی اتباع کرنی چاہیئے نہ کہ اللہ اور رسول کے باغیوں کی شکل و صورت یا شباہت اختیار کرنی چاہیئے بلکہ داڑھی رکھنے پر شرم و حجاب آنا

الٹا بے شرمی کی بات ہے اور اسلامی غیرت اور حمیت کے خلاف بھی۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس زمانہ میں بد قسمتی سے بعض مسلمان اس امتیازی عمل سے دور ہیں جو سنت رسول صلعم ہے اور اسی دوری کیوجہ سے داڑھی رکھنے کو معیوب سمجھتے ہیں اور بے جا تاویلات نکالکر داڑھی رکھنے کی شرعی حیثیت کو غیر اہم قرار دیتے ہیں۔ ایسے سخت ماحول میں ان لوگوں سے اگر قطع تعلق کا معاملہ کریں تو اس سے فتنہ کا اندیشہ ہے کہ ان میں ضد اور نفرت پیدا ہوگی جس کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ وہ سرے سے داڑھی رکھنا ہی ناپسند کرنے لگیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ حکمتاً ان لوگوں سے ربط و تعلق قائم رکھا جائے اور مناسب موقعوں پر انہیں نرمی اور صلاحیت سے داڑھی رکھنے کی تلقین کی جائے اور اس جانب توجہ دلائی جائے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کا ایک راستہ سے گذر ہوا جہاں زازان نامی شخص اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا جو خوش الحانی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ آپ نے چلتے چلتے فرمایا کہ کاش یہ خوش نصیب اپنی خوش آوازی کو بجائے گانے کے قرآن پڑھنے میں استعمال کرتا۔۔۔ اس نے یہ اشارہ سن لیا اور دوستوں سے آپ کی بابت دریافت کیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ آپ صحابی ہیں تو آپ کی یہ آرزو اس کے دل پر اثر کر گئی اور اس نے تلاوت قرآن کی طرف توجہ دینی شروع کی اور مشہور قاری بن گیا اور اور حضرت ابن مسعودؓ کے تلامذہ میں شمار کیا جانے لگا۔ اس لیے بسا اوقات ربط و تعلق کام آجاتا ہے اور انسان کی اصلاح کے لیے مناسب موقع پر اصلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

یہ بات متفق علیہ ہے کہ داڑھی نہ رکھنا ایک سخت گناہ ہے۔ اس لیے داڑھی نہ رکھنے والوں کو یہ نیت باندھنی چاہیئے کہ وہ داڑھی رکھیں۔ اللہ داڑھی نہ رکھنے کو معاف بھی کر سکتا ہے لیکن گناہ پر قائم رہنا نادانی ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

بعض لوگ داڑھی کا مذاق اڑاتے ہیں اور تمسخر یا استہزا کرتے ہیں۔ یہ سخت گناہ ہے بلکہ کفر ہے کیونکہ اس میں اللہ کے رسول صلعم کی اہانت ہے۔ اس لیے اس

سے بچنا چاہیئے۔

(۲) رسول اللہ صلعم نے اذان یا اقامت کے کلمات سے پہلے نہ درود شریف کے اضافہ کی تعلیم دی اور نہ اسے اذان کا جز قرار دیا۔ اذان دینے والوں میں حضرت بلالؓ حضرت ابن مکتومؓ اور حضرت عبد اللہ بن ابی محذورہؓ مشہور ہیں لیکن اس قسم کا اضافہ کسی سے کہیں بھی ثابت نہیں ہے۔

(۳) حضور صلعم کا فرض نمازوں کے بعد کبھی دعا کرنا بھی ثابت ہے اور کبھی سلام پھیرنے کے بعد مختصر سے عرصہ کے لیے توقف کرنا بھی ثابت ہے لیکن دعا پر التزام ثابت نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اجتماعی دعا کا جو نظام اور رواج ہے اس پر التزام ثابت کیا جارہا ہے اور کیا جاتا ہے حالاں کہ فرض نماز کے سلام پھرنے کے بعد عبادت کا اجتماعی عمل ختم ہوجاتا ہے اور سنت کی رو سے اس کے بعد انفرادی عمل کے لیے مقتدی آزاد ہوجاتا ہے کہ چاہے دعا کرے یا وظیفہ پڑھے یا اٹھ کر چلا جائے یا موقع ہو تو نفل نماز پڑھے وغیرہ۔

چنانچہ علامہ کشمیری رح (جو اس صدی کے چوٹی کے علماء میں شمار کیے جاتے ہیں) نے لکھا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کرنا نہ حضور صلعم کے زمانہ میں ثابت ہے اور نہ صحابہ کے زمانہ میں ۔۔۔ البتہ خاص موقعوں پر مثلاً کسی جنگ کے بعد آپ صلعم نے شہیدوں کے لیے دعا فرمائی ہے۔ ○○

اصلاح نفس یا ذاتی اصلاح

(مولانا نوال الرحمن)

۹ فبروری ۱۹۸۸ء

سورہ عصر میں جن چار باتوں کا ذکر ہے کہ انسان خسارہ میں ہے بجا ہے سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے (یہ ذاتی اصلاح کے لیے ہے) اور جو حق کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تلقین کرتے رہے (یہ دوسروں کی اصلاح کے لیے ہے ۔

قرآن میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ حضرت داؤدؑ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اپنے نفس کی خواہشات پر نہیں چلنا ۔ یعنی یہ کہ پیغمبر جو معصوم ، سراپا نور و ہدایت کا سرچشمہ ، سلیم الطبع اور عین فطرت انسانی پر چلنے والے ہوتے ہیں ان کو بھی نصیحت کی جارہی ہے کہ اتباع نفس خطرناک ہے ۔ نقصان دہ ہے اور آخر میں ہلاکت کا سبب بنتا ہے ۔

خدا نے شیطان کو نار سے پیدا کیا جو اپنے غرور تکبر اور گھمنڈ کی وجہ سے راندہ درگاہ ہوا ۔ اس کے مقابلہ میں ے فرشتہ کو پیدا کیا جو نوری مخلوق ہیں ۔ یہ ہمیشہ اطاعت فرمانبرداری اور خدا کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں ۔ ان کی اور شیطان کی نہیں بنتی ۔ دونوں میں عداوت ہے اور یہ جنگ آپس میں ہمیشہ جاری رہتی ہے ۔ اسی طرح انسان میں خدا نے "ہوا" یعنی خواہشات کو پیدا کیا جو ہمیشہ برے ارادوں اور بری آرزوں کی طرف اکساتی ہے ۔ اس کے مقابلہ میں "عقل" کو پیدا کیا جو صحیح اور سیدھے راستہ کی نشاندھی کرتی ہے ۔ اسی طرح دو اور چیزوں کو خدا نے پیدا کیا ۔ ایک "نفس" جسکا کام بھی خدا کی باتوں سے بعد و دوری پیدا کرنا ہے جس میں شیطان معاون بنتا

ہے اس کے مقابلہ میں ہے "قلب" جو بصیرت کا متلاشی ہوتا ہے۔
اب گویا ان چھ چیزوں کی آپس میں ہمیشہ جنگ چلتی رہتی ہے اور آپس میں دشمنی اور عداوت برقرار رہتی ہے:

اس طرح "خیر" کی طرف لیجانے والی چیزیں ہیں:
(۱) فرشتے یا ملکوتی صفات (۲) عقل (۳) قلب

اور "شر" کی طرف لے جانے والی چیزیں ہیں:
(۱) شیطان یا شیطانی صفات (۲) ہوا (۳) نفس

ان دونوں گروہوں کی جنگ انسان میں مرتے دم تک جاری رہتی ہے۔ کبھی وہ غالب تو کبھی یہ غالب، کبھی انکا پلہ بھاری تو کبھی ان کا پلہ بھاری۔ مگر انسان کو ہمت نہ ہارنا چاہیئے اور خدا کی مدد، نصرت اور فضل و رحمت کو للکارنا چاہیئے خاصکر جب وہ شیطانی مکر و فریب کا شکار بننے لگیں۔ چنانچہ خدا نے فرمایا کہ اگر تم کو شیطانی وساوس یا ان کے حملوں سے پریشانی ہو تو تم ہمیں یاد کر لیا کرو۔ امن پاؤ گے۔

چنانچہ ایک قصہ جانوروں کی زبان میں بیان کیا گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی طاقتور دشمن کا سامنا ہو تو بچنے کی ترکیب یہ ہیکہ اس سے طاقتور ہستی کی مدد حاصل کی جائے۔

ایک کوے کا قصہ جس کے انڈے ایک سانپ کھاجایا کرتا تھا جس سے وہ بہت تنگ آگیا تھا۔ سانپ سے لڑنا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ اس نے حسب قاعدہ ایک ہشیار لومڑی سے مشورہ کیا۔ اس نے ایک آسان ترکیب بتائی کہ وہ شہزادی کا ہار چرالے جب وہ بناؤ سنگھار کے لیے آیئنے کے مقابل ہو اور اسے اس موذی سانپ کے قریب ڈالدے۔ چنانچہ اس نے ویسا ہی کیا۔ فوج آئی اور سانپ کو مار کر ہار محل میں لے گئی۔

شیطان اتنا تجربہ کار اور ماہر ہے کہ وہ باوا آدم سے لیکر تا حشر تمام نسل انسانی کو خدا کے راستے سے بھٹکانے کا وعدہ خود خدا سے لے چکا ہے۔ اس کا دام، فریب اور
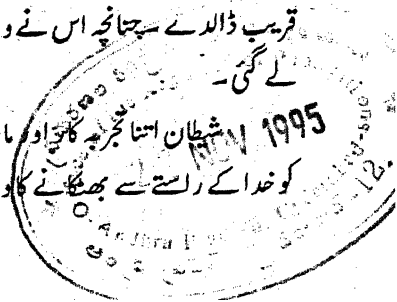
اس کی عیاری و مکر بہت سخت ہوتا ہے۔وہ دین کو بے دین، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ، کھرے کو کھوٹا اور کھوٹے کو کھرا بنا کر پیش کرتا ہے۔عالم کے پاس علم کے بہانے، جاہل کے پاس جہالت کے بہانے، امیر کے پاس دولت کے بہانے، غریب کے پاس مفلسی کے بہانے ایسے چور دروازے سے داخل ہوتا ہے کہ اس کو گمان تک نہیں ہوتا کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح؟

مثال شیعہ فرقہ کی ہے کہ ان کو "عشق اہل بیت" کے عنوان پر ایسا اچھالا کہ وہ دین کی باونڈری کے باہر ہیں مگر اپنے نزدیک اسے عین دین اور عشق اہل بیت پر مرمٹنے کی عمدہ مثال سمجھتے ہیں اور اس اعزاز پر پھولا نہیں سماتے حالاں کہ حقیقتاً سب بے دینی ہے اور خود سے فراڈ کرنا ہے۔

چنانچہ شیطان نے حضرت آدمؑ کو جنت میں یوں بہکایا کہ گیہوں کا دانہ کھانے سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں رہیں گے۔اور خدا کے مقرب اور خاص بندے بنکر خاص عنایت سے سرفراز ہوں گے حالاں کہ کھانے کے نتیجہ میں وہ جنت سے بے دخل کر دیئے گئے۔

اگر کوئی مسلمان علم دین سیکھ کر اس زعم میں ہو کہ اس نے بہت بڑا کام کیا ہے تو یہ ایک دھوکہ ہے جبکہ وہ اس علم پر عمل نہ کر رہا ہو۔علم میں تو اضافہ ہوتا رہے گا۔بحث مباحثے ہوتے رہیں گے لیکن عملی میدان میں معاملہ اگر صفر ہو اور اس پر عمل نہ کیا جارہا ہو تو ایسا عمل بے فیض ہے اور کسی کام کا نہیں۔

واقعہ: مولانا سعید گنگوہی کا واقعہ جو اپنے دادا پیر کے خلیفہ کے پاس جو بلخ میں تھے دینی وراثت کے طور پر علم و بصیرت حاصل کرنے بلخ تشریف لے گئے۔بڑی آؤ بھگت ہوئی بلخ کے مرشد نے اپنا عمامہ بچھا کر ان کا استقبال کیا۔لیکن جب انہیں علم ہوا کہ صاحبزادے روحانی علم کے طلبگار ہیں تو مرشد کی نگاہ بدل گئی اور انھوں نے اپنے درس میں بیٹھنے سے منع کیا اور کوئی چھ آٹھ ماہ اپنے مریدین کی غلاظت و بول و براز اٹھانے کا کام ان کے تفویض کیا اور ایک دن بوڑھی بھنگن کو یہ حکم دیا کہ سعید

گنگوہی کے سر پر غلاظت اور کچرا عمداً ڈال دے اور اس کا رد عمل آکر بیان کرے۔
چنانچہ بادل نخواستہ بھنگن نے وہ کام کر دکھایا۔
سعید گنگوہی کا جواب تھا "اے بھنگن! اگر تو گنگوہ میں ہوتی تو تجھے دیکھ لیتا۔

جب مرشد کے آگے یہ واقعہ بیان ہوا تو کہنے لگے ابھی خناس دل سے نہیں گیا۔ البتہ درس میں بیٹھنے [illegible] اجازت تو دیدی مگر زبان کھولنے پر امتناع تھا۔
پھر چند ماہ [illegible] بھنگن سے اسی قسم کا مطالبہ کیا گیا۔ اب کی بار غلاظت جب سعید گنگوہی پر گرائی گئی تو وہ بجائے غضبناک ہونے کے، آبدیدہ ہوئے اور بھنگن سے لگے معافی چاہنے کہ میں درمیان میں آگیا اور تجھے دوبارہ یہ غلاظت اٹھانی پڑے گی چنانچہ خود سب غلاظت اٹھا اٹھا کر پھینک [illegible] دے۔
اس واقعہ کے بعد مرشد نے کہا کہ ہاں اب تم کامیاب ہوئے۔ اسطرح خانقاہوں میں نفس کو توڑنے کے لیے ریاضتیں کروائی جاتی تھیں۔
ایک حدیث کا مضمون ہے کہ آدمی تین باتوں سے ہلاک ہو جاتا ہے۔
(۱) شیطان کی پیروی کرنے سے
(۲) خواہشات کے پیچھے بھاگنے سے
(۳) اپنے آپ کو بڑا سمجھنے سے (یہ سب میں زیادہ سخت ہے)
بظاہر شیطان نظر نہیں آتا۔ اور چھپ چھپ کر وار کرتا ہے۔ حقیقتاً شیطان سے زیادہ طاقتور انسان ہے لیکن جب آدمی پوری طرح شیطان کے چنگل میں آجاتا ہے اور اس کا پیرو بن جاتا ہے تو شیطان اس کی شاگردی قبول کرتا ہے اور اسے اپنا گرو یا استاد ماننے لگتا ہے۔
شیطان ہر کام خلاف حقیقت ظاہر کرتا ہے اور انسان کو دھوکے میں ڈالتا ہے تب صرف خدا سے مدد مانگنی چاہیئے اور اسی کا سہارا طلب کرنا چاہیئے۔
قرآن کی تلاوت سے بھی بھٹکنا ممکن ہے۔ شیطان یہاں بھی دھوکہ دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن پڑھنے سے پہلے اعوذ باللہ من الشطین الرجیم پڑھنا واجب ہے تاکہ خدا کی پناہ میں آجائیں۔